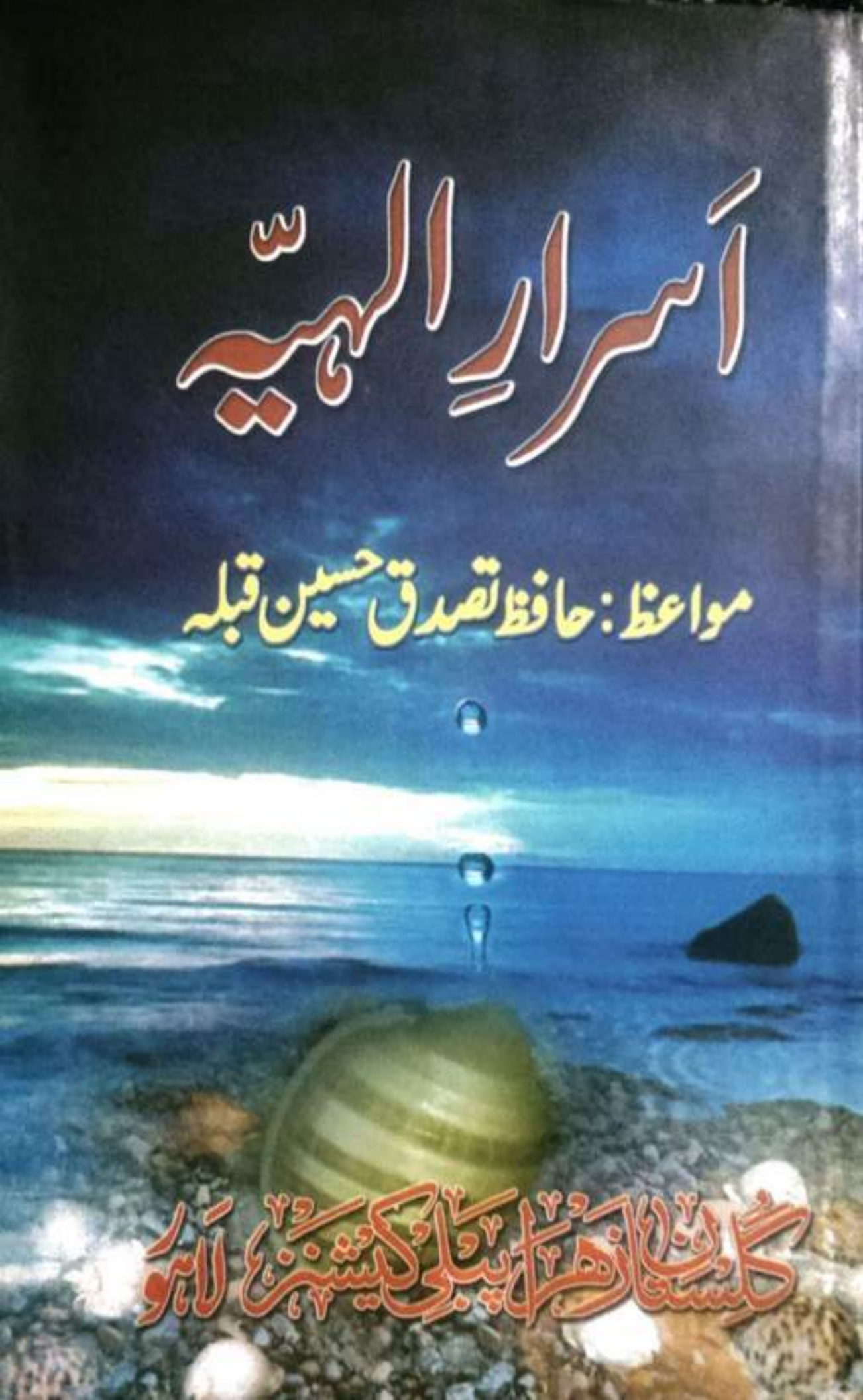
اَسرارِ الٰہیہ
مواعظ: حافظ تصدق حسین قبلہ
گلستان زہرا پبلی کیشنز لاہور

یہ کتاب سکین کے لئے چوہدری محمد خان صاحب
(آف راماں) نے عطا فرمائی تھی
امام زمانہ عج انکی توفیقات خیر میں مزید اضافہ
فرمائیں ..
آمین

TaabeerMurtaza.ml
Best Search Engine For
Online Books

# اَسرارِ الٰہیّہ

﴿مواعظ﴾

## حافظ تصدق حسین قبلہ

.....﴿ناشر﴾.....

گلستان زہراؑ پبلیکیشنز ۲۶۔ایبٹ روڈ لاہور۔54000

القائم بک ڈپو
مالمقابل امام بارگاہ بھون روڈ چکوال

# انتساب

بیگم جسٹس جمیل حسین رضوی (مرحوم)

کے نام

# فہرست


| نمبر شمار | عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| **درس اوّل** | | 15 |
| صفات الٰہیہ کی تشریح | | 23 |
| | صفت صوتی۔<br>صفت مکتوبی۔<br>صفت مجازی یا مشروطی۔<br>صفت تحقیقی یا وجودی۔ | 25 |
| | خطبہ توحید<br>معرفت کی تعریف | 26<br>28 |
| **درس دوم** | توحید فی الذات، توحید فی الصفات | 30 |
| خداوند عالم کی صفات | | 36 |
| 1- صفات ثبوتیہ (حقیقیہ) | 1- حی۔<br>2- عالم۔<br>3- قادر مختار۔<br>4- قدیم۔ | 36<br>37<br>38<br>38 |

| | | |
|---|---|---|
| | 5-مرید۔ | 39 |
| | 6-مدرک۔ | 39 |
| | 7-متکلم۔ | 40 |
| | 8-صادق۔ | 41 |
| 2-صفات اضافیہ (اعتباریہ) | | 41 |
| 3-صفات سلبیہ | 1-لاشریک۔ | 44 |
| | 2-مرکب نہیں ہے۔ | 45 |
| | 3-جسم جوہر وعرض نہیں ہے۔ | 46 |
| | 4-محل حوادث نہیں۔ | 47 |
| | 5-حلول نہیں۔ | 47 |
| | 6-مرئی نظر آنے والا نہیں ہے۔ | 47 |
| | 7-محتاج نہیں۔ | 48 |
| | 8-لذت والم (کیفیات) نہیں۔ | 49 |
| کیف کی 4 اقسام ہیں | 1- کیفیات محسوسہ | 51 |
| | 2- کیفیات استعدادیہ۔ | 51 |
| | 3- کیفیات نفسانیہ۔ | 51 |
| | 4- کیفیا تکمیہ۔ | 52 |
| **درس سوم** | | 59 |
| طبیعت | | 64 |
| عزیزہ | | 64 |
| جسمانی خواہشات | جسمانی خواہشات کی اقسام | 66 |

| | | |
|---|---|---|
| روحانی خواہشات | 1- حقیقت جوئی | 67 |
| | 2- اخلاق حسنہ | 69 |
| | 3- حسن پسندی | 70 |
| | 4- خلاقیت (ابتکار وابداع) | 71 |
| | 5- عشق وپرستش | 71 |
| | لفظ عشق | 72 |
| | عشق مجازی (جنسی) | 73 |
| | عشق روحانی | 74 |
| محبت ومودت میں فرق | | 75 |
| عشق کی تکلیف | | 80 |
| حرص وطمع میں فرق | | 81 |
| تکبر | | 82 |
| حسد | | 84 |
| | اسباب حسد | 85 |
| **درس چہارم** | | 88 |
| حصول علم کے ذرائع | 1- علم خارجی۔ | 88 |
| | 2- علم باطنی۔ | 93 |
| | ماحصل | 99 |
| **درس پنجم** | | 105 |
| انسان دو قسم کے ہیں۔ | 1- جاہل۔ | 114 |
| | 2- عالم۔ | |
| علم بھی دو قسم کا ہے۔ | 1- اکتسابی | 114 |
| | 2- وہبی | |

| | | |
|---|---|---|
| کیا حضرت آدمؑ اول مخلوق ہیں؟ | | 115 |
| کیا حضرت نوحؑ اول مخلوق ہیں؟ | | 115 |
| کیا حضرت ابراہیمؑ اول مخلوق ہیں؟ | | 115 |
| کیا حضرت موسیٰؑ اول مخلوق ہیں؟ | | 116 |
| کیا حضرت داؤدوسلیمانؑ اول مخلوق ہیں؟ | | 116 |
| کیا حضرت عیسیٰؑ اول مخلوق ہیں؟ | | 116 |
| کیا محمد مصطفیٰؐ اول مخلوق ہیں؟ | | 116 |
| **درس ششم** | | 123 |
| علوم حقیقیہ وھبیہ کی قسمیں | 1- علم جزئی وھبی۔<br>2- علم کلی۔ | 124 |
| صفت ذاتی کی مزید تشریح | | 128 |
| وجود امام تین قسم پر ہے۔ | | 139 |
| **درس ہفتم** | | 150 |
| سابقین، مقربین اور انبیاء مرسلین واوصیاء کرام میں اللہ تعالیٰ نے پانچ روحیں رکھی ہیں۔ | 1- روح الحیات۔<br>2- روح القوۃ۔<br>3- روح الشھوۃ۔<br>4- روح الایمان۔<br>5- روح القدس۔ | 157<br>157<br>157<br>158<br>158 |

| | | |
|---|---|---|
| **درس ہشتم** | | 179 |
| اقسام عالم | 1-عالم سرمدی۔<br>2-عالم دھری۔<br>3-عالم زمانی۔ | 183 |
| **درس نہم** | عصمت | 196 |
| | عصمت کی تعریف<br>مختلف آراء (عصمت کے بارے میں) | 197<br>199 |
| گناہ کی اقسام | 1-زلل۔<br>2-سیئہ۔<br>3-خطیئہ۔<br>4- کبیرہ۔<br>5-فاحشہ۔<br>6-جرم۔<br>7-ذنب | 205<br>206<br>206<br>207<br>207<br>207<br>208 |
| **درس دہم** | انبیاء و مرسلین کے چار طبقے ہیں۔ | 214 |
| رسالت خاتم کے پانچ عہدے | | 217 |
| امامت مطلقہ کے پانچ عہدے | | 218 |
| تدین اور تمدن میں فرق | | 229 |

## پیش لفظ

تمام حمد اس اللہ کے لیے ہے جس کی مدح تک بولنے والوں کی رسائی نہیں..... جسکی نعمتوں کو گن نہیں سکتے۔ عقل وفہم کی گہرائیاں اس کی تہہ تک پہنچ نہیں سکتیں۔ دین کی ابتدا اس کی معرفت ہے..... کمال معرفت اس کی تصدیق ہے..... کمال تصدیق اس کی توحید ہے..... وہ ہر شے کے ساتھ مگر جسمانی اتصال سے مبرا..... وہ ہر چیز سے دور مگر جسمانی دوری کی طرح نہیں۔ آدم کو تخلیق کیا اسے گھر میں ٹھہرایا مگر جب اس نے یقین، شک اور ارادے کے استحکام کو کمزوری کے ہاتھوں بیچ ڈالا تو ندامت اٹھانی پڑی۔ اللہ نے آدم کے لیے توبہ کی گنجائش رکھی۔ رحمت کے کلمے سکھائے۔ افزائش نسل سے نوازا۔

آج ایسا وقت ہے کہ جن چیزوں کو ہم جانتے ہیں ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے جن چیزوں کو جانتے نہیں انہیں دریافت نہیں کرتے۔ جب تک مصیبت آنہیں جاتی ہم خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ اس دور میں علماو دانش وروں اور معاشرہ کے صاحب اثر ونفوز کی ذمہ داری ہے کہ تعصب اور حب وبغض سے بالا تر ہو کر علمی مطالعے فرمائیں۔ ہم مختلف المذاہب معاشرہ کے افراد ہیں..... فردی اختلافات کے باوجود خدائے واحد پر ایمان میں متحد ہیں، اس کے سوا کسی کی عبادت کو کفر وشرک سمجھتے ہیں سب اسکی عظمت، خالصیت، قوت وربوبیت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

کفر، جہل، ظلم، جبر، شرک وبدعت سے بچاؤ کا ذریعہ صرف علم اور تقوی ہے جو اہل بیتؑ کا اثاثہ ہے۔ اس سے دوری کا سبب انسان اور انسانیت کی تباہی وبربادی

کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اللہ کا قرب حصول علم سے ہی ممکن ہے..... اپنے علم کو جہل اور یقین کو شک میں بدلنے نہ دو۔ یہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ اللہ کے اسرار و صفات کو نظر محمدؐ و آل محمدؐ سے پہچاننے کی کوشش کریں۔ حافظ تصدق حسین صاحب کی یہ تحریریں ہر قاری کو اسی بصیرت سے نوازتیں ہیں۔ ان کے لیے اگر یہ کہا جائے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

تو غلط نہ ہے ذہنوں میں اٹھنے والے تقریباً سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ یہ بھی واضح ہوگا کہ ابتدائے اسلام کے افکار سے آج کے افکار اور انداز فکر میں کیا کیا تغیر رونما ہو چکے ہیں۔

ان تحریروں کا مقصد حق بینی کا ملکہ پیدا کرنا اور حق گوئی کے جذبے کو بیدار کرنا ہے۔ اس تحریر میں ادبی نکتہ فرنیاں، لفظی و معنوی صنائع و بدائع کی بہتات کے باوجود پیغام کے اخلاص اور لہجے کی سادگی اور دردمندی آپ کو متوجہ رکھے گی۔

میرے والد جسٹس سیّد جمیل حسین رضوی (مرحوم) کی زندگی ملت اسلامیہ کے تفرقے کی نفی میں گزری۔ انکی یاد میں اس مشن کو جاری رکھنے کے لئے یہ سلسلہ شروع کر رہا ہوں کہ ایسی تحریروں کو جمع کیا جائے جس کے زریعے اثاثہ اہل بیتؑ، جو کہ علم ہے، اس کی روشنی سے ہر گھر منور کیا جا سکے۔ اس اثاثے سے دوری کا سبب انسان اور انسانیت کی تباہی و بربادی کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ آیئے اس کا مداوا کریں۔ میری اس کاوش پر آپکی آرا میرے لیے مشعل راہ ہوں گی۔ دعا فرمائیں کہ میری یہ کوشش سعادت تک پہنچے۔ آمین

طالب دعا۔

طالب رضوی

## حدیث رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم

یَا عَلِیُ مَا عَرَفَ اللّٰہ، اِلَّا اَنَاوَاَنْتَ

اے علی اللہ کو کسی نے نہیں پہچانا مگر میں نے اور تم نے

مَا عَرَفَنِیُ اِلَّا اَنْتَ وَ اَللّٰہ

مجھے کسی نے نہیں پہچانا مگر تو نے اور اللہ نے

مَا عَرَفَكَ اِلَّا اَنَا وَ اَللّٰہ

تجھے کسی نے نہیں پہچانا مگر میں نے اور اللہ نے

## عرض ناشر

گلستان زہرا پبلی کیشنز آپ کی خدمت میں محترم جناب حافظ تصدق حسین صاحب قبلہ کے 2002ء میں نیویارک میں رمضان المبارک میں دیئے گئے دروس میں سے پہلے دس درس پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ کوشش تو تھی کہ تمام درس ایک ہی کتاب کی شکل میں پیش کئے جاتے مگر حافظ تصدق حسین صاحب قبلہ کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے فوری ممکن نہ ہو سکا۔

جناب طالب رضوی صاحب کی ذاتی توجہ، کوشش و کاوش سے یہ مجموعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر زندگی نے مہلت دی تو خواہش و کوشش ہے کہ باقی کے بیس درس اور گلستانِ زہرا 26۔ ایبٹ روڈ پر پڑھے ہوئے عشرے بھی شائع کر سکوں۔

مجھے یقین ہے کہ جناب حافظ تصدق حسین صاحب قبلہ کی ان تقاریر میں اہل علم و نظر کے ذہنوں میں مقام محمدؐ و آل محمدؐ کے اللہ تعالیٰ سے قربت و مرتبہ کے بارے میں اٹھنے والے سوالوں کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں جس طرح بیان کیئے گئے ہیں ایمان کو جلا بخشتے ہیں۔

میں جناب حافظ تصدق حسین صاحب قبلہ کا انتہائی ممنوں ہوں کہ انہوں

نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود کمپوزنگ کو دوبارہ درست فرمایا۔ دعا گو ہوں کہ جناب زہراؑ اس کاوش کو قبول فرمائیں اور ہمارے لیے توشہ آخرت ہو۔

خاکپائے اہل بیتؑ

خلیفہ سید حسن مہدی

26۔ ایبٹ روڈ لاہور

# درس اوّل

رَفِیْعُ الدَّرَجَات ذُوالْعَرْشِ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ ○ (پارہ نمبر 24 آیت نمبر 15 سورہ المومن)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ درجات کا بلند کرنے والا عرش والا ہے یعنی صاحب عرشِ علم تقدیر وتدبیر ہے۔ وہ اپنے عالم امر سے ایک خاص روح اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے تا کہ وہ شخص اس روح (امری) کے ذریعہ روز قیامت سے ڈراتا رہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس آیت مجیدہ میں مقام ومرتبہ وحقیقت نبوت کو بیان فرما رہا ہے۔ معانی الاخبار میں ہے

اَلنُّبوۃُ لَفظٌ مَاخُوْذٌ مِنَ النَّبوۃِ وَھُوَ مَا اَرْتَفَعُ مِن الْاَرضِ فَمعنَی النُّبوۃُ الرِّفْعَۃُ وَمَعْنَی النَّبِیِ الرَّفِیْعُ ○

یعنی لفظ نبوۃ ماخوذ ہے نبوۃ سے اور نبوۃ زمین بلند ومرتفع کو کہتے ہیں۔ پس نبوت کے معنی رفعت ہیں اور نبی رفیع الدرجہ کا نام ہے۔

اور کلام جوہری یہ ہے۔

اَلنبیُ فَعِیْلٌ یَعنی فَاعِلٌ لِلْمُبَالَغَةِ مِنَ النَّباءِ الخبرِ لِاَنَّهٗ اَنْبِیَاءَ عَنِ اللّٰهِ اَی اَخْبَرَ۔

یعنی نبی بروزن فعیل بمعنی فاعل ہے۔ بغرض مبالغہ اور مشتق ہے نباء بمعنی خبر سے۔ کیونکہ وہ مخبر عن اللہ ہوتا ہے۔

وَقِیْل اِنَّ النَّبِیَّ مُشتَقٌّ مِنَ النَّبَاوَةِ وَهِیَ الشیئُ المرتفعُ۔

یعنی کہا گیا ہے کہ نبی مشتق ہے نباوۃ سے اور وہ شے مرتفع کو کہتے ہیں۔ یعنی نبی بمعنی صاحب درجہ عالیہ مرتفعہ ہے۔

علامہ طبرسی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں: اَلرَّسُوْلُ الَّذِیْ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ وَلَا یُحْمِلُ عِنْدَ الاطلاقِ عَلٰی غیر رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله وسلم۔

وَالنَّبِیُّ الَّذِیْ لَهُ الرِفْعَة وَالدَّرَّجَةُ الْعَظِیْمَةُ بِالاِرْسَالِ۔ یعنی رسولؐ وہ ہے جس کو خدا ارسال فرمائے اور عند الاطلاق صرف رسول خدا ﷺ ہی پر محمول کیا جاتا ہے اور نبی وہ ہے جس کو خدا نے رفعت اور بلند درجہ عظیم عطا کیا ہے اور تمام مخلوقات پر اس کو علو و شرف حاصل ہے۔

فَکُلّ رسولٍ نَبِیٌّ وَلَیس کلّ نبیٍ رَسُوْلًا وَقِیل بل الرسولُ هو المبعوثُ اِلٰی اُمَّةٍ وَالنَبِیُّ هُوَالَّذِیْ لَا یُبْعَثُ اِلٰی اُمَّةٍ۔ یعنی ہر ایک رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہے اور کہا گیا ہے کہ رسولؐ وہ ہے جو کسی امت پر مبعوث ہو اور اس کی طرف بھیجا جائے اور نبی وہ ہے جو کسی امت پر مبعوث نہ کیا جائے

جب نبوت ایک درجہ رفیعہ کا نام ہے تو رفعت (بلندی) کا تعلق نبوت سے ہے نہ ذات خداوندی سے۔ یعنی خدا درجوں کے تقابل سے بلند نہیں ہے۔ وہاں درجات کی بلندی نہیں ہے۔ وہ ایک واجب الوجود ذات ہے۔ ہستی ہے جہاں تقابل کی نفی کا نام توحید ہے۔ وہ لیس کمثلہ شی ہے واجب الوجود نہ جسم ہے نہ جسمانی۔ یعنی جب جسم نہیں تو ان چیزوں سے بھی وہ ذات منزہ ومبرہ ہے جو سارے جسموں کے لئے ضروری ہیں جیسے جز' طول' عرض' عمق' حد' نہایت' حرکت' سکون وغیرہ۔ جب یہ بات واضح ہو چکی کہ اس کی ذات اقدس کے لئے حد ونہایت ناممکن ہے تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صرف عالم علوی میں ہے عالم سفلی اس سے خالی ہے یا ایک مقام سے دوسرے مقام پر آتا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں صورتیں اس کی تحدید (حد بندی) اور اس کے لئے اشارہ کو چاہتی ہیں۔ حالانکہ ذات اقدس ان سے مبرہ ومنزہ ہے۔

نہج البلاغہ۔ ارشاد امیر المومنینؑ: سبق فی العلو فلاشی اعلیٰ منه وقرب فی الدنو فلاشی اقربُ منه۔ وہ ذات برتری میں اتنا آگے ہے کہ کوئی شے اس سے اعلیٰ نہیں ہو سکتی اور نزدیکی میں اس حد پر ہے کہ کوئی چیز اس سے زیادہ قریب نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جب تک مکانی بلندی کی گفتگو رہے گی ایک مکان دوسرے مکان سے بالا اور اعلیٰ نکلتا آئے گا تا اینکہ مکان کی گفتگو ختم ہو جائے۔ جہاں یہ کہا جا سکے کہ اب کسی قسم کی جگہ نہیں ہے۔ اس وقت خالق مکان کے سوا کوئی شے مکان سے اعلیٰ نہ ہوگی۔

اور یہ بھی ایک امر حقیقت کہ جب ایک جسم دوسرے جسم سے متصل و متحدہ ہو جاتا ہے تو قربِ مکانی اپنی آخری حد پر پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے زیادہ قرب کی منزل اسی کو حاصل ہوگی جو دو جسموں کے قرب و اتصال کا موجد ہو۔ لہٰذا واجب الوجود سے نہ کوئی اعلیٰ ہوگا نہ قریب تر۔ معلوم ہوا کہ اس کا علو اور اس کا قرب دونوں حدود مکان سے بالاتر ہے۔

مفسرین نے رفیع الدرجات کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

(1) اللہ بڑے درجوں والا ہے۔

(2) بلند درجوں والا ہے۔

(3) بڑے عالی درجے والا ہے۔

یہ ترجمہ شانِ الوہیت کے لئے صحیح و درست نہیں ہے۔ اللہ درجوں سے بلند نہیں ہوا۔ مقابل کے درجوں سے اسکی بلندی متصور نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ایک ہستی ہے۔ ذات ہے تقابل کی نفی کا نام توحید ہے۔ وہاں درجہ بندی کے اعتبار سے بلندی و رفعت نہیں ہے۔ بلکہ رفیع الدرجات کا صحیح اور جامع ترجمہ ہے۔ کہ وہ درجات کو بلند کرنے والا ہے۔ خود بلند درجہ نہیں ہے۔ بلکہ درجات عطا کرنے والا ہے۔ اس بلند درجات کے اوّلین درجہ کو نبوت کہتے ہیں۔

ذاتِ حق وجود بے حد و نہایت، ہستی مطلق ہے۔ اسکی کوئی ماہیت نہیں۔ وہ ذاتی ہے کسی حد سے محدود نہیں۔ اس کے یہاں اُس ماہیت کا گزر نہیں جو اسے کسی خاص ''نوع'' میں محدود کر دے یا ایک محدود وجود کو اس سے مخصوص کر دے۔

کوئی بھی زاویہ وجود اس سے خالی نہیں۔ اس کے یہاں کسی فقدان کا تصور

نہیں، صرف ایک ہی فقدان اس کے یہاں پایا جاتا ہے اور وہ فقدانِ فقدان ہے۔ اگر کسی سلب کا اس پر صادق آنا ہے تو وہ سلب کا سلب ہے۔ اگر کسی نفی وعدم کو اس کی صفت قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ مخلوقیت، معلولیت، محدودیت و کثرت یا تجزی ومحتاجی جیسے نقص وعدم کی نفی ہے اور وہ واحد سرحد جس میں وہ قدم نہیں رکھتا سرحد عدم ہے۔ وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن کسی چیز میں نہیں اور کوئی چیز بھی اس کے ہمراہ نہیں۔

کسی چیز کے اندر نہیں لیکن کسی چیز سے باہر بھی نہیں۔ وہ ہر قسم کی کیفیت اور ہر طرح کی تشبیہ وتمثیل سے مبرہ ومنزہ ہے۔ کیونکہ یہ سب اس موجود کے اوصاف ہیں جو محدود ومتعین وصاحب ماہیت ہوتے ہیں۔

جناب علی علیہ السلام اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں۔

مَعَ کُلِّ شئٌ لَا بِمُقَارنةٍ وغیرُ کُلِّ شئٌ لا بمزایلةٍ۔ (نہج البلاغہ)

وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن جسمانی اتصال کی طرح مقارن نہیں کہ نتیجتاً وہ چیز بھی اس کے قرین وہم دوش ہو۔

وہ ہر چیز سے مغائر وعلیحدہ ہے۔ وہ عین اشیاء نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ اشیاء سے دور ہو اور وجوداتِ اشیاء اس کی ذات کی حد سمجھی جائے۔ پھر فرمایا

لَیس فِی الاشیاءِ بوالجٍ ولا عنها بِخَارجٍ۔ (از نہج البلاغہ)

وہ چیزوں کے اندر نہیں۔ اس نے اشیاء میں حلول نہیں کیا ہے کیونکہ حلول کا لازمہ حلول کرنے والی شے کی محدودیت اور اس کا تحیر ہے اور اسی حالت میں وہ کسی چیز سے باہر بھی نہیں کیونکہ باہر ہونے کا لازمہ بھی ایک قسم کی محدودیت ہے۔ (محدود) ہونا ہے۔

پھر فرمایا:

بانَ مِنَ الاشیاءِ بِالقَھر لھا والقدرۃِ علیھا وَبانتِ الاشیاءُ مِنہ بالخضوع۔(از نہج البلاغۃ)

وہ سب چیزوں سے اس لئے جدا ہے کہ وہ ان پر چھایا ہوا ہے اور ان پر قدرت رکھتا ہے۔ اور واضح ہے کہ کبھی قاہر عین مقہور قادر عین مقدور و مسلط عین مسخر نہیں ہوتا اور تمام چیزیں اس لئے اس سے جدا ہیں کہ وہ اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ اس کی بارگاہ میں مسخر ہیں اور جو چیز اپنی ذات میں خاضع و مسخر و عین خضوع اطاعت ہو وہ اس کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتی جو اپنی ذات میں بے نیاز ہے۔

اشیاء سے حق کی جدائی و مغایرت اس طرح نہیں ہے کہ کسی حد و فصل نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو بلکہ اس کا تعلق ربوبیت' مربوبیت' کمال و نقص' قوت و ضعف سے ہے۔

خدا واجب الوجود ہے۔ موجود ہے بذاتہ۔ ظاہر ہے بذاتہ حکماء کے نزدیک 'وجود' نور ہے اور لا وجودَ الا اللّٰہ۔ وجود حقیقتاً خدا ہی کا ہے۔ ورنہ ہم سب تو اس کے وجود سے موجود ہوئے ہم اس کی مانند وجود نہیں رکھتے۔

فالوجود. اما حقّ. او مطلقٌ. او مقیّد۔

وجود حق وجود واجب الوجود ہے اور وہ ایک ہی ہے۔

فلا وجود اِلّا لِلّٰہِ۔ وجود مطلق۔

وجود محمدؐ و آل محمدؐ ہے اور وہی مقام خلق ہے۔ وہی مقام امر ہے کہ یہ مظہر

جامع ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| وہ خالق ہے | محمدؐ وآل محمد خلق ہیں | ہم مخلوق ہیں |
| وہ آمر ہے | محمدؐ وآل محمد اُمر ہیں | ہم مامور ہیں |
| وہ حاکم ہے | محمدؐ وآل محمد حکم ہیں | ہم محکوم ہیں |

یہ نور اول۔ مخلوق اول۔ تمام کائنات کی علت ثانیہ ہے۔

اور نور ہے۔ اس لئے یہی وجود منسبط کائنات ہے۔

اللہ واجب الوجود ہے۔ کیونکہ نور وجود ہے۔ ظلمت عدم ہے۔ نور کی نقیض ظلمت ہے۔ اگر وہ نور نہیں تو ظلمت ہوگا ظلمت عدم ہے وجود نور ہے۔ تو ارتفاع نقیضین لازم آئے گا۔ جو محال ہے۔ لہٰذا ثابت کہ وہ ظلمت نہیں نور ہے۔ نور ہی وجود ہے۔

دعائے نور.....از جوشن کبیر نمبر 47

يَا نُورَ النُّورِ يَا مُنَوِّرَ النُّورِ يَا خَالِقَ النُّوْرِ يَا مُدَبِّرَ النُّورِ يَا مُقَدِّرَ النُّوْرِ يَا نُوْرَ كُلِّ نورٍ يَا نُورُقَبْلَ كُلِّ نُورٍ يَا نورُ بَعْد كُلِّ نُورٍ يَا نورُفَوقَ كُلِ نُورٍ يَا نورُلَيسَ كَمِثْلِه نورُ۔

وہ اثبات میں نور ہے۔ عدم ظلمت کے مقابل میں نور ہے۔ وہ نور ہے مگر کسی نور کی مثل نہیں پس وہ شے ہے مگر کسی شے سے مشابہ نہیں۔ حدیث پاک۔

هُو نورٌ لَا كَالَاْ نوارِ وشئٌ لَا كَالَاْشياءِ فهو لَيس كمثلهٖ شئ۔

وہ شے ہے مگر مثل اشیاء نہیں وہ نور ہے مگر مثل انوار نہیں۔

لہٰذا نتیجہ نکلا کہ اللہ واجب الوجود بلند درجوں والا نہیں بلکہ درجات کو وہی بلند کرنے والا ہے۔

اصول کافی۔ جلد اول باب معانی الاسماء۔ حدیث نمبر 8'9 صفحہ 159۔

اصول کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک دلکش حدیث نقل کی گئی ہے۔ امام اپنے صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے یکا یک ایک آدمی نے جو امامؑ کے قریب بیٹھا تھا اللہ اکبر کہا۔ امامؑ نے فرمایا: اَللّٰہُ اکبرُ مِنْ اَیِّ شیٍٔ خداوند عالم کسی چیز سے بلند ہے؟ وہ شخص کہتا ہے۔

اَللّٰہُ اکبرُ من کلِّ شیٔ۔ اللہ ہر چیز سے بلند و بالا ہے۔ تو امامؑ نے فرمایا: وَکَانَ ثمَّ شَیٔ فَیَکُونُ اَکْبَر مِنہ۔ کیا کوئی چیز تھی جس سے خدا بزرگ رہا ہو۔ خدا کے مقابل کوئی بھی چیز شمار کے قابل نہیں ہے۔ جسے کہا جائے کہ خدا اس سے بڑا ہے۔ فرمایا: ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تم موجودات کو کسی حد تک مستقل مانتے ہو۔

اللہ اکبر کے یہ معنی نہیں ہیں۔ راوی کہتا ہے میں نے کہا فقلت وما ھو؟ پھر اللہ اکبر کے معنی کیا ہیں؟ تو حضرتؑ نے فرمایا اللّٰہُ اکبرُ مِن ان یُّوصَفَ۔ خدا اس بات سے بڑا ہے کہ اس کی صفت بیان کی جا سکے۔

دوسری روایت: ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے کہا۔ اللہ اکبر۔ حضرت نے فرمایا اللّٰہ اکبرِ من ایِّ شیٔ خدا کس چیز سے بڑا ہے۔ اس نے جواب دیا مِن کل شیٔ خدا ہر چیز سے بڑا ہے۔ فقال ابو عبداللّٰہؑ فقد حددتَہٗ۔ فرمایا تو نے خدا کی حد بندی کر دی۔ تو نے خدا کو ایک مرتبہ میں قرار دیا اور

موجودات کو دوسرے مرتبہ میں۔ پھران دونوں کا آپس میں قیاس کیا فقال الرجلُ کیفَ اقولُ! اس شخص نے کہا مولا پھر مجھے کیا کہنا چاہئے۔ امامؑ نے فرمایا: اللّٰہ اکبر من ان یوصف۔ خدااس بات سے بڑا ہے کہ اس کی توصیف کی جاسکے۔

## صفات الٰہیہ کی تشریح:

صفات۔ صفت حد بندی کا نام ہے مثلاً عالم اسے کہتے ہیں جس کی علم کے ساتھ حد بندی کر دی گئی ہو۔ جب علم کی صفت کی بات آئیگی اس دائرہ علم میں فقط علم ہی علم ہوگا اور دوسری صفت مثلاً قدرت یا حکمت وغیرہ نہ ہوگی۔ اس طرح رحیم صفت ہے۔ فقط دائرہ میں رحمت ہی رحمت ہوگی قدرت نہ ہوگی۔ قدرت میں فقط قدرت ہو گی رحمت نہیں ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ گویا ہر صفت ایک قسم کی حد بندی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں۔ زائد برذات نہیں۔ جیسے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

العلم ذاته ولا معلوم والقدرة ذاته ولا مقدور والسمع ذاته ولا مسموع والبصر ذاته ولا مبصر فلما احدث الاشياء لكان المعلوم۔

علم اس کی ذات ہے وہ معلوم (جانا ہوانہیں ہے) قدرت اس کی ذات ہے وہ قدرت دیا ہوانہیں ہے۔ سمع اس کی ذات ہے وہ سنا ہوانہیں ہے۔ بصر اس کی ذات ہے وہ دیکھا ہوانہیں ہے۔ جب اس نے چیزوں کو پیدا کیا تو معلوم بنیں۔ یعنی جب علم، قدرت، سمع بصر وغیرہ اس کی ذات کی طرف منسوب ہوں تو وہ وہاں ذات کہلاتی ہیں نہ کہ صفات ہاں جب یہ حادث ہو جائیں تو پھر صفات کہلاتی ہیں۔ ذات

صفت نہیں ہوتی۔ صفت ذات نہیں ہوتی۔ اگر صفت عین ذات ہو تو صفت نہیں کہلا سکتی ذات کہلائے گی۔ اس لئے ذات کو سمجھنے کے لئے صفت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ صفت ہی قابل بیان ہوتی ہے جبکہ ذات قابل بیان نہیں ہوتی۔

صفت قابل تقسیم شے ہے۔ یعنی صفت ہی میں کم و بیشی ہوتی ہے۔

صفت ہی مرکب ہوتی ہے لفظ و معنی و مفہوم و تصور سے۔

صفت محدود ہوتی ہے۔ لفظ و معنی و مفہوم و تصور سے۔

صفت ہی محتاج ہوتی ہے بیان کی۔ جب تک بیان نہ ہو صفت نہیں کہلاتی۔ اس لئے محدود محتاج ہوتی ہے بیان کرنے والے کی۔

صفت قابل ادراک ہوتی ہے۔ جب تک ادراک نہ ہو صفت بیان نہیں ہو سکتی ہے جس طرح جسم اپنے حدود سے نظر آتا ہے اسی طرح صفت اپنے حدود سے تسلیم وادراک ہوتی ہے۔ اگر ادراک سے بالاتر ہو تو نہ صفت کہلا سکتی ہے نہ بیان ہو سکتی ہے۔

صفت کو حدوث ہوتا ہے۔ صفت کو حدوث ہوتا ہے۔ بیان سے۔ زبان سے۔ قلم یا احساس سے۔

صفت مرکب ہوتی ہے۔ اپنے اثر سے اگر اثر شامل نہ ہو نہ محسوس ہو نہ بیان۔

صفت کی 4 شکلیں یا صورتیں ہوتی ہیں۔

1- صفت صوتی۔

2- صفت مکتوبی۔

3- صفت مجازی یا مشروطی۔

4- صفت حقیقی یا وجودی۔

## صفت صوتی

یہ صفت آواز اور الفاظ کی محتاج ہوتی ہے جو بیان سے محدود ہوتی ہے۔

## صفت مکتوبی

یہ کاغذ سیاہی۔ قلم اور کاتب کی محتاج ہوتی ہے اور تحریر کی حد تک محدود۔

## صفت مجازی یا مشروطی

یہ صفت قابل تقسیم ہوتی ہے اور مشروط کی محتاج شرط سے محدود ہوتی ہے۔

## صفت حقیقی یا وجودی

صفت حقیقی اصلی و جوہر ہوتی ہے۔ جبکہ صوتی مکتوبی مجازی مشروطی عرض ہوتی ہیں۔ یہ بیان صفاتِ ذات پر محمول ہے۔ مثلاً علم۔ زبان سے ادا ہو یا بیان ہو تو عرض ہوگا جو کسی جوہر (عالم) کے بغیر بیان نہیں ہوسکتا۔ مکتوبی ہو تو بغیر کاتب کے تحریر میں نہیں آسکتا۔ عارضۃً کسی میں نظر آئے تو مظاہرے کی حد تک عرض ہوگا۔ البتہ یہ تینوں صفات عرض ہیں۔ یہ وجود میں نہیں آسکتی جب تک علم کا جوہر (عالم) بطور علم وجودی یا حقیقی اپنے جسم اور وجود سے موجود نہ ہو۔ جو محدود بہ جسم ہوگا اور محدود بہ علم ہوگا۔

ہر صفت، صفت وجودی یا جوہر کی محتاج ہوتی ہے اور جوہر کی حرکت وجودی سے ظاہر و ثابت ہوتی ہے۔ جوہر خود محدود و جسم میں ہوتا ہے اور وجود یا جسم یا حدود یا ترکیب سے پیدا ہوتا ہے۔

جوہر ایسی شے کو کہتے ہیں جو مخلوق ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نہ مجسم ہے نہ مخلوق ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نہ عرض ہے نہ جوہر ہے۔

ذات نہ قابل بیان ہوتی ہے۔ ذات نہ قابل ادراک ہوتی ہے۔

ذات نہ قابل تقسیم ہوتی ہے۔ ذات نہ قابل احساس ہوتی ہے۔

ذات جب بھی سمجھی جاتی ہے بذریعہ صفات۔ جب ذات خدا نہ جوہر ہے نہ عرض۔ نہ صفت نہ موصوف ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ مرکب ہے۔ نہ مجسم۔ نہ محل حوادث ہے وغیرہ بلکہ جوہر و عرض صفت و موصوف کا خالق ہے۔

## خطبہ توحید

احتجاج طبرسی ص 174 جلد 2: امام رضاؑ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ صفت ہے۔ نہ موصوف۔ ہر صفت و موصوف ایک دوسرے کے غیر ہوتے ہوئے مخلوق ہیں۔ صفت و موصوف ایک دوسرے کے ہم نشین و شریک ہیں۔

موصوف محتاج ہے صفت کا۔ بغیر صفت کی شرکت کے موصوف نہیں کہلا سکتا۔ صفت غیر موصوف کے وجود کی صفت نہیں کہلا سکتی۔ اللہ تعالیٰ ایک ذات ہے اس میں کوئی صفت یا مثل، شبہ یا جسم شریک و سہیم و دخیل نہیں ہیں۔ وہ لاشریک لہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ مرکب نہیں ہے کیونکہ مرکب ترکیب و شرکت سے ہوتا ہے جو مخلوق ہوتا ہے اسے ترکیب میں لانے والے کی احتیاج ہوتی ہے۔ اجزاء کی شرکت سے مرکب بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لاشریک ہے مرکب نہیں ہے۔ قل ھو اللہ احد ہے۔

نہ وہ محل حوادث ہے نہ متغیر و مرئی ہے۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں ترکیب و جسم

سے متعلق ہیں۔

وہ ان چیزوں سے مبرہ ومنزہ ہے۔

لہٰذا خالق اپنی پہچان کرانے کے لئے ایسی مخلوق پیدا کرے اپنے علم و قدرت کے تحت جو اس کی صفات کی حامل ہو۔ اس کی صفات کے مظہر۔ محل و مقام ہو۔ تمام صفات الٰہیہ اس کے وجود سے ظاہر ہوں اور وہ اللہ کا رسول و امام و نبی ہونے کا دعویٰ کرے ساتھ ساتھ معجزات بطور دلیل نبوت و امامت یا ثبوت نبوت و امامت دکھلائے اور اللہ ان کی اطاعت و اتباع کا حکم بھی دے تا کہ لوگ ان کی اطاعت و اتباع کر کے صراط مستقیم پر چل کر قیامت میں کامیاب و کامران و درستگار ہوں۔

اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے دو ذریعے ہیں۔ ذرائع کو دلیل کہتے ہیں۔

دلیل لِمّی..... دلیل اِنیّ۔ دلائل کی اقسام دو ہیں۔ لمیہ۔ انیہ۔

**دلیل لِمّی:** موثر کو دیکھ کر اثر کو تسلیم کرنا دلیل لمّی کہلاتا ہے۔ جیسے کہا جائے فلاں فلاں ڈاکٹر کا لڑکا ہے۔ یعنی ڈاکٹر صاحب کے ذریعے لڑکا کی پہچان کرانا۔

اللہ خود کسی کا اثر نہیں ہے۔ اس لئے اسے کسی دوسرے موثر سے نہیں پہچانا جاسکتا۔ اس لئے اللہ کے لئے دلیل لمّی نہیں ہیں۔

**دلیل اِنیّ:** اثر کو دیکھ کر موثر کو تسلیم کرنا۔ دلیل اِنیّ کہلاتی ہے۔ جیسے نقش قدم کو دیکھ کر گزرنے والے کو تسلیم کرنا۔ دھواں دیکھ کر آگ کو تسلیم کرنا۔ یا دھوپ دیکھ کر سورج کی موجودگی کو تسلیم کرنا۔ اس لئے معرفت کی بھی یہی تعریف ہے۔

## معرفت کی تعریف

ادراک الشی بتفکر و تدبر لاثرہ۔ اثر کو دیکھ کر موثر کو پہچاننا معرفت کہلاتا ہے۔

خالق کو جو ناقابلِ ادراک ہے اسے تسلیم کرنے کا واحد ذریعہ دلائل انیہ ہیں۔ ہم مخلوقات کو دیکھ کر خالق کی موجودگی اور ہونے کا یقین حاصل کرتے ہیں۔

چونکہ خالق ومخلوق کے مابین وسیلہ واسطہ نبی امام ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ سے خالق کی پہچان حاصل ہوتی ہے۔ ہر نبی، ہر معصوم خالق کی پہچان کا ذریعہ ہے۔ مگر باعتبار فضیلت محمدؐ وآل محمدؐ اللہ تعالیٰ کی پہچان کے کامل ترین ذریعہ ووسیلہ ہیں۔ ان سے بہتر کوئی ذریعہ، اکمل اقویٰ نہیں ہے۔ انہی کے لئے خالق نے فرمایا: یایھا الذین آمنوا اتقو اللّٰہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ۔ انہی کو خالق تک پہنچنے کا وسیلہ بناؤ۔ چنانچہ جب ہمیں خالق کی پہچان مطلوب ہوئی تو ان صاحبان علوم نے معرفت و پہچان کرائی ہے۔ (توحید صدوق مطبوعہ تہران ناشر مکتبہ صدوق 1387ھ صفحہ 231)

حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے حضرتؑ سے عرض کیا مجھے خدا کی اس طرح پہچان کرائیں کہ گویا میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ حضرتؑ نے اس نے سوال کیا۔ آیا۔ کبھی تم نے سمندر کا سفر کیا ہے (گویا حضرت کو معلوم تھا کہ اس طرح کا واقعہ اس کے ساتھ رونما ہو چکا ہے) اس نے کہا۔ ہاں

امامؑ نے فرمایا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ تمہاری کشتی سمندر میں ٹوٹ گئی ہو؟ کہا جی ہاں اتفاق سے ایک سفر کے دوران اس طرح کا واقع پیش آیا ہے۔ فرمایا ایسی منزل بھی

آئی کہ تمہاری امیدیں سب طرف سے قطع ہوگئی ہوں اور تم نے خود کو موت کے سامنے کھڑا پایا ہو؟

کہا۔ جی ہاں۔ یہ بھی ہوا ہے۔

فرمایا: کیا اس وقت نجات کی کوئی امید باقی تھی؟

کہا جی ہاں!

فرمایا اس وقت جبکہ کوئی ذریعہ تمہاری نجات کا نہ تھا۔ تمہاری امیدیں کس سے وابستہ تھیں؟

فرمایا اسی کیفیت میں بھی جس سے امیدیں وابستہ ہوں۔ اس کو ذاتِ خدا کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

# درس دوم

(توحید فی الذات، توحید فی الصفات) کے متعلق جناب امیر المومنین علیہ السلام کا خطبہ۔

اوّل الدین معرفته وکمال معرفته التصدیق به وکمال التصدیق به توحیده و کمال توحیده الاخلاص له وکمال والاخلاص له نفی الصفات عنه لشهادة کل صفة انها غیرالموصوف وشهادة کل صفة انها غیرالموصوف وشهادة کل موصوفٍ انه غیرالصفة فمن وصف الله سبحانه فقدقر نه ومن قرنه فقدثناه ومن ثناهٗ فقد جزاه ومن جزاه فقد جهله ومن جهله فقد اشار الیه ومن اشار الیه فقد حدهٗ ومن حده فقد عدهٗ ومن قال فیم فقد ضمنته ومن قال علام فقد اخلی منه. هو کائن لاعن حدث موجود لاعن عدم۔

دین کی بنیاد (سرا) معرفت ہے اور اس کی معرفت کا کمال اس کی تصدیق

ہے کہ وہ یقیناً ہے اور اس کی تصدیق کا کمال اسے احد و یکتا ماننا ہے اور اس کو یکتا ماننے کا کمال اسے اس کے غیر سے پاک جاننا ہے اور اسے اس کے غیر سے پاک جاننے کا کمال اس سے ممکنات کی صفات کی نفی کرنا ہے کہ یہ صفتیں اس میں نہیں ہیں۔ کیونکہ ہر صفت گواہی (شاہد) دیتی ہے کہ وہ موصوف سے جدا (غیر) ہے اور ہر موصوف گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنی صفت سے الگ (غیر) ہے۔ لہٰذا اب اگر کوئی خدائے سبحانہ کو موصوف ٹھہرائے تو اس نے خدا کو وصف (صفت) کا ہمدوش (ساتھی) بنا دیا اور جس نے اس کو اس کے وصف (صفت) کا ساتھی مانا وہ اس کی دوئی کا قائل ہوا۔ اور جس نے اس کے لئے دوئی مانی اس نے اس کو جزو والا ٹھہرایا۔ اور جس نے اسے جزو والا سمجھا اس نے اس (خدا) کو سمجھا ہی نہیں اور جو اسے نہ سمجھے گا وہ اس کی جانب (طرف) اشارہ کرے گا (یا اسے اشارہ کے لائق سمجھا) اور جو اشارہ کرے گا وہ اس کے لئے حد مانے گا اور جو اس کے لئے حد تجویز کرے گا وہ اسے شمار میں بھی لائے گا اور جس نے یہ پوچھا کہ خدا کس چیز میں ہے اس نے خدا کو اسی چیز میں (مظروف) قرار دیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے تو اس نے دوسرے مقام کو اس سے خالی سمجھا۔ وہ ہے ہوا نہیں۔ موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا۔ وہ واجب الوجود ہے واجب الوجود نہ اشارہ کے اندر آسکتا ہے اور نہ اس کی حد مقرر کی جاسکتی ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ ذاتِ اقدس الٰہی عین وجود ہے اور عین وجود نہ زبان نہ مکان نہ اوصاف و کیفیات کسی وصف کے لحاظ سے محدود نہیں ہوسکتا۔ نہ اس کی جانب حسی اور عقلی اشارہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ جو شی محدود اور قابل اشارہ ہوتی ہے وہ عدم سے بچ نہیں سکتی۔

## تشریح: (1)

اس کو یکتا ماننے کا کمال اس کیلئے اخلاص پیش کرنا ہے یعنی اسے اس کے غیر سے پاک جاننا ہے۔ اس فقرے کی توضیح کیلئے معنی اخلاص سے باخبر ہونا ضروری ہے۔

اخلاص' کا مادہ' خ.....ل.....ص..... خلص ..... ہے۔ اسی سے خلوص بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی شی کا اپنے غیر کی آمیزش (ملاوٹ) سے پاک وصاف ہونا۔ چنانچہ جب پانی میں کدورت نہ ہوتو کہتے ہیں "خلص الماء" پانی خالص رہا اور کوئی رنگ اپنی اصلی حالت پر ہوتو کہتے ہیں "خلص اللون" رنگ خالص رہا۔ اسی لحاظ سے (لا الہ الا اللہ) کو کلمہ اخلاص کہتے ہیں کہ اس میں معبودیت حقیقیہ کے لحاظ سے غیر خدا کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی معبود ہونے کا استحقاق صرف خدا ہی کا حصہ ہے اس کا غیر اس امر میں اس کا شریک نہیں ہے۔ جناب امیر المومنینؑ کے کمال توحید الاخلاص لہ کے یہ معنی ہیں خدائے احد و یکتا کی ذات۔ اس کے افعال اور استحقاقِ معبودیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور جو کوئی ان باتوں میں کسی کو اس کا شریک مانے گا وہ حقیقت توحید کی معرفت سے بے بہرہ ہوگا۔ موحد نہیں ہوگا۔

اسی مفہوم کی جانب امام راغب اصفہانی نے اخلاص کے معنی میں اشارہ کیا ہے۔ الاخلاص البتری عن کل مادون اللہ اخلاص کے معنی ہیں ماسوی اللہ سے برأت کرنا۔ حاصل یہ کہ جو شخص مذکورہ بالا چاروں منزلوں میں غیر سے برأت کرے اور اس کے غیر کو اس کا شریک نہ قرار دے وہی مخلص و موحد ہے ورنہ مشرک۔

## تشریح:(2)

اور اسے اس کے غیر سے پاک جاننے کا کمال اس سے ممکنات کی صفتوں کی نفی کرنا ہے ذاتِ باری تعالیٰ کو صفات سے خالی سمجھنا بظاہر بے عقلی ہے کیونکہ قرآن مجید میں سینکڑوں مقامات پر اس کے صفات کا تذکرہ موجود ہے۔ مثلاً علم، قدرت، خلق، رزق، رحم، قہر، وغیرہ وغیرہ نیز جب دلیل عقل کے ذریعہ عالم کو حادث اور محتاجِ خالق مانا جائے اور ذاتِ واجب کو اس عالم کا موجد تسلیم کر لیا جائے تو ایجاد کیلئے قدرت و علم کا ماننا ضروری ہے۔ لیکن ایک مقام پر یہ بھی ارشاد فرماتا ہے لیس کمثلہ شئی (اس کے مثل کوئی شی نہیں ہے) جس کا حاصل یہ ہے کہ عالم امکان ذات اور صفت سے مرکب ہے اور ہر مرکب بلاشبہ شی ہے اور کوئی شی خدا کے مثل نہیں۔ لہٰذا عالم امکان خدا کے مثل نہیں۔

اُدھر قرآن مجید میں خدا کی صفتوں کا بہ کثرت ذکر ادھر آیات کا صریحی نتیجہ کہ عالم امکان جو ذات اور صفت سے مرکب ہے اسی کے مثل نہیں۔ ان دونوں حقیقتوں کو ملانے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عالم امکان کی بسیط سے بسیط تر شی بھی مرکب ہی نکلے گی اور وہ حقیقت میں خدا سے جدا ہے۔ لہٰذا منزل توصیف میں ذاتِ اقدس الٰہی ترکیب سے پاک ہے اور جب ترکیب سے بری ہے اور صاحب صفاتِ کمال بھی ہے تو اس کے یہی معنی ہوں گے کہ اس کے صفات عین ذات ہیں۔ یعنی قدرت خدا ہے اور خدا قدرت ہے علم خدا ہے خدا علم ہے۔ اس میں عالم امکان کی طرح ذات اور وصف کا امتزاج (ملاوٹ) اور موصوف و صفت کا اجتماع نہیں ہے۔ اسی مطلب کو

جناب امیر المومنینؑ واضح فرمارہے ہیں کہ اس کے اخلاص کا کمال یہ ہے کہ اس سے نفی صفات کردو۔ یعنی اس کے صفات کو زائد بر ذات نہ مانو۔ عین ذات جانو۔ کیونکہ ہر موصوف جس کی صفت اس کی ذات سے الگ ہو وہ خود کو اپنی صفت کا غیر بتاتا ہے اور وہ صفت خود کو اپنے موصوف سے الگ بتاتی ہے اور یہ منافی توحید ہے۔

**تشریح:(3)**

اسی لئے امیر المؤمنین علیہ السلام بعد کے فقروں میں فرماتے ہیں کہ اس توضیح کے بعد بھی اگر کوئی شخص خدا کو ایسا موصوف مانے جیسا عالم امکان ہے تو وہ خدا کے وصف کو اس کی الوہیت کا غیر اور ازلیت میں اس کا ساتھی بتاتا ہے اور یہ خلافِ عقل ہے۔ کیونکہ جو وصف (صفت) بھی اس ذاتِ اقدس واعلیٰ سے جدا مان کر اس میں ثابت کیا جائے گا یا وہ حادث ہوگا یا قدیم۔ اگر حادث ہوگا اور کسی وقت ذاتِ خدا میں رونما ہوا تو۔

(ا) ازل میں ذاتِ خدا کا صفت کمال سے خالی ہونا لازم آئے گا کیونکہ یہ وصف حادث اگرچہ حادث ہے مگر کمال ہے ورنہ خدا میں نہ پایا جاتا۔

(ب) اس وصف کے ذاتِ خدا میں حادث ہونے سے پہلے اس وصف کا عدم اور بعد حدرث اس کی ذات میں اس کا وجود ماننا پڑے گا اور یہ ہے تغیر جو ذاتِ واجب اور عین ہستی کے لئے محال ہے۔ جب اس وصف کے حادث ماننے پر دو خرابیاں لازم آتی ہیں جو ذاتِ واجب کیلئے عقلاً محال ہیں تو اس وصف کو قدیم مانا جائے گا۔ اس صورت میں ذات اور وصف دونوں اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے

کے محتاج ہوں گے۔ ذات قبل اتصاف محتاج ہوگی کہ صفت کو پائے اور صفت محتاج ہو گی کہ محل ملے اور احتیاج عدم ہے کیونکہ کسی شی کی احتیاج کے یہی معنی ہیں کہ وہ شی محتاج کے پاس نہیں ہے لہٰذا اگر ذات واجب محتاج وصف ہو اور اس کا وصف جو ذات سے الگ مانا گیا ہے محتاجِ ذات و محل ہو تو ذات کے پاس وصف نہ ہوگا اور وصف کے پاس محل نہ ہوگا اور ذاتِ واجب جو عین ہستی ہے اس تجویز کی بنا پر عدم سے موصوف ہوگی اور یہ معلوم ہے کہ ایک ہی محل پر عدم اور وجود جمع نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ بھی مسلم ہے کہ ذاتِ خدا میں ترکیب (مرکب ہونا) نہیں تا کہ اس کے ایک جزء کو وجود کا محل مانیں اور دوسرے کو عدم کا کیونکہ مرکب بھی اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور احتیاج عدم ہے جو ہستی کی نقیض ہے۔ لہٰذا ذاتِ خدا میں احتیاج کی گنجائش نہیں۔

حاصل یہ کہ خدا کے صفات کو اس کی ذات سے علیحدہ ماننا عقلاً محال ہے اور جو اس محال کا قائل ہوگا وہ اپنی جہالت کا ثبوت دے گا اور اسی جہالت کے سبب خدا کو قابل اشارہ سمجھے گا اور محدود بھی مانے گا اور یہ دونوں باتیں واجب الوجود کی ضد ہیں اور اسے ممکنات کے ساتھ شمار میں لائے گا۔ بلکہ اس ذاتِ اقدس کی توحید کے خلاف جتنے عقیدے ہیں ان سب کا قائل ہو جائے گا پھر نہ تو وہ عارف باللہ ہوگا نہ موحد۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ **ولا اياه عنى من شبهه ولا صمده من اشار اليه وتوهمه۔** (نہج البلاغۃ) اور ہرگز خدا کو مراد نہیں لینا جو اسے مخلوق سے تشبیہ دیتا ہے اور نہ اس کا قصد کرنا جو اس کی جانب اشارہ کرتا ہے اسے اپنے وہم کے اندازہ میں لاتا ہے۔

اب اسی مفہوم کو دوسرے طریقے سے بیان کیا جاتا ہے۔

## خداوند عالم کی صفات تین طرح کی ہیں۔

1- صفاتِ ثبوتیہ (حقیقہ)

2- صفاتِ اضافیہ (اعتباریہ)

3- صفات سلبیہ۔

## 1-صفات ثبوتیہ (حقیقہ)

جیسے علم وقدرت، حیات اور ارادہ وغیرہ وہ صفات ہیں جو حقیقی ہیں ان کو صفاتِ کمال بھی کہتے ہیں یہ صفاتِ اکرام بھی کہلاتی ہیں۔

یہ صفات آٹھ ہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا ذاتِ باری کے لئے ہونا واجب ہے اور ان پر ہمارا عقیدہ رکھنا ضروری ولازم ہے۔ ان صفات ثبوتیہ کو صفاتِ کمال بھی کہتے ہیں۔ یہ تمام صفات عین ذات ہیں زائد برذات نہیں ہیں۔ یہ صفاتِ ذات ہیں نہ صفاتِ فعل۔ یہ صفات غیر محدود ہیں۔

1- حی۔

2- عالم۔

3- قادر مختار۔

4- قدیم۔

5- مرید۔

6- مدرک۔

7- متکلم۔

8- صادق۔

## 1- حی

حی (زندہ) وہ ازل سے زندہ ہے اور ابد تک زندہ رہے گا۔ اسے کبھی بھی فنا

وزوال نہیں ہے۔

(ا) یہاں تک کہ وہ خود اپنی موت پر بھی قادر نہیں ہے اگر چہ خالق خود بھی چاہے تو اپنے آپ کو ختم نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی حیات واجب ہے۔ جس طرح کہ وہ ظلم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ عصمت اس کے لئے واجب ہے۔

(ب) علم وقدرت حیات کی فرع ہیں۔ بغیر حیات کے ان (علم و قدرت) کا وجود ناممکن ہے۔ علم وقدرت اللہ کی عین ذات ہیں تو نتیجہ نکلا کہ حیات خالق بھی عین ذات ہے عین ذات کا وجود واجب بالذات ہوتا ہے۔

(ج) فرع (یعنی علم وقدرت) اللہ کی عین ذات ہیں تو اصل (حیات) عین ذات کیوں نہیں ہو سکتی۔ جب علم وقدرت اس کا بالذات ہے تو حیات بھی بالذات ہے۔

## 2-عالم

(ا) اللہ کا علم وہبی یا کسبی نہیں بلکہ اس کا علم ذاتی بالذات ہے وہ ہر کل وجز ظاہر و باطن کا عالم ہے۔ اس لئے وہاں علم جہل کی نفی کا نام ہے۔

(ب) علم صفت کمال اور جہل صفت نقص ہے اللہ ہر صفت کمال سے متصف ہے اور ہر نقص وعیب سے منزہ ومبرا ہے۔ اس کا علم ہر شی کو محیط ہے۔ **وھو بکل شی محیط۔**

(ج) اللہ تعالیٰ ہر اس شی کا عالم ہے جس میں معلوم ہونے کی صلاحیت ہے خواہ وہ شی واجب ہو یا ممکن، قدیم ہو یا حادث، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ حی ہے اور ہر حی

کے لئے صحیح ہے کہ اس کو علم ہو۔ ورنہ وہ حی بالذات نہیں ہوسکتا۔

## 3- قادر مختار

قادر مختار ہے مجبور و مضطر نہیں ہے:

(ا) اللہ جو چاہے۔ جیسے چاہے۔ جہاں چاہے کرسکتا ہے۔

(ب) وہ قادر مختار ہے جس کو ایک ہی فعل کے کرنے یا نہ کرنے پر مع قصد و ارادہ قدرت و اختیار ہو۔ وہ اپنے افعال و اعمال میں مجبور نہیں ہے جیسے۔ آگ جلانے میں۔ آفتاب چمکنے میں۔ پانی بہنے میں۔

(ج) مجبور و مضطر ہونا نقص ہے ذات ایزدی میں کسی نقص کی گنجائش نہیں ہے۔ فاعل مختار کا فعل قصد و ارادہ و علم کے بعد ہوتا ہے اور فاعل موجب (مجبور) کا فعل علم و ارادہ قصد کے ماتحت نہیں ہوتا۔ فاعل مختار کا فعل وجود میں فاعل کی ذات سے موخر ہوسکتا ہے کہ ذات فاعل موجود ہو اور فعل موجود نہ ہو لیکن فاعل موجب (مجبور) کا فعل وجود میں ذات فاعل کے وجود سے مؤخر نہیں ہوسکتا بلکہ جب سے ذات کا وجود ہوتا ہے اس وقت سے اس کے فعل کا وجود ہوتا ہے۔ مثلاً آگ اور اس کا جلانا۔ آگ کے وجود کے ساتھ احراق (جلانا) کا وجود ہے۔

## 4- قدیم

(ا) قدیم اللہ موجود ہے۔ وہ ازلی ابدی سرمدی ہے۔ وہ قدیم ذاتی ہے۔ مسبوق بالغیر نہیں ہے۔ یعنی کوئی غیر اس سے قبل نہیں ہے۔ اس لئے لاشریک ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ واجب الوجود کے لئے عدم محال ہوتا ہے۔ لہٰذا ازلی ابدی سرمدی ہے۔ اگر اس پر کسی وقت عدم طاری ہوسکتا ہو تو کسی دوسرے موثر و خالق کا محتاج ہوگا جو اسے عدم سے نکال کر عرصہ وجود میں لائے۔ لہٰذا وہ واجب الوجود نہیں رہے گا۔ حالانکہ وہ واجب الوجود ہے۔

(ج) اللہ تعالیٰ کی ذات کی کوئی علت نہیں ہے۔ (بلکہ وہ خود تمام معلولات کی علت نامہ ہے) جس ذات کی کوئی علت ہی نہ ہو اس کے لئے فانی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (یعنی فانی ہونا محال ہے)

## 5-مرید

مرید و کارہ ہے: اللہ صاحب ارادہ و اختیار ہے۔ مجبور نہیں ہے۔ وہ فعال لما یرید کا مصداق ہے اور بعض افعال کی نہی فرمائی ہے امر و نہی ارادہ و کراہت کو مستلزم ہیں۔ اللہ کا ارادہ اس کی عین ذات ہے۔ یرید و لا یضمر۔ علیؑ۔ خدا ارادہ کرتا ہے لیکن کوئی چیز دل و دماغ سے نہیں گزارتا جبکہ ارادہ حادث ہوتا ہے لیکن اللہ کا ارادہ اس کی حیثیت اور اس کا چاہنا ہے جو عین ذات ہے۔

## 6-مدرک

اللہ تعالیٰ صاحب ادراک ہے مگر ادراک کے لئے کانوں کا۔ ادراک نظارہ کے لئے آنکھوں کا اور اسی طرح دیگر ادراکات کے لئے کسی عضو کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ بلا اعضاء وہ ہر قریب و بعید، بلند و پست، اعلیٰ و ادنیٰ اور ظالم و مظلوم کی آہ و بکا کو سنتا

ہے اور ظلم و زیادتی کو دیکھتا ہے۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیرہ۔ علم عام ہے ادراک خاص ہے۔ ادراک علم کے علاوہ ایک صفت ہے۔ اشیاء محسوسہ کے علم سے ہم میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو ان کے ادراک سے پیدا ہوتی ہے۔ علم میں حاسۂ ادراک متاثر نہیں ہوتا مگر ادراک میں حاسۂ ادراک متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کیفیات نہیں ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ادراک کے وہ معنی نہیں ہیں جو ہمارے ادراک کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ادراک کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تمام محسوسات کا عالم ہے۔

## 7- متکلم

(ا) اللہ تعالیٰ بغیر زبان کے کلام کرتا ہے۔ وہ کلام کرنے میں محتاج لسان نہیں ہے۔ علیؑ فرماتے ہیں۔ ھو یقول ولا یلفظ اللہ بولتا ہے مگر لفظوں کے ساتھ نہیں۔ یعنی بولتا ہے مگر تلفظ نہیں کرتا۔ لابصوتٍ یقرع ولا بنداء یسمع بل کلامہ ایجادہ۔ نہ کسی آواز کے ذریعہ جو کانوں سے ٹکرائے نہ کسی ندا کے ذریعہ جو کان سے سنی جائے بلکہ اللہ کا کلام اس شی کا ایجاد کر دینا ہے۔ قرع۔ معنی کھٹکھٹانا۔

(ب) اظہارِ مقصد کے لئے کلام کرنا ایک کمال ہے اور خداوند عالم ہر کمال سے متصف و مزین ہے۔ وہ ہماری طرح کلام نہیں کرتا کیونکہ کلام حادث فعل ہے (عرض ہے محتاج جوہر سے) یعنی قائم بالغیر ہے۔ اصول ہے جس کے ساتھ حادث قائم ہوگا وہ محل حوادث ہوگا۔ جو محل حوادث ہوگا وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتا بلکہ ممکن الوجود و حادث ہوتا ہے۔ حادث کے معنی نیا۔ قدیم کے معنی پرانا۔ حادث وہ

موجود ہے جس کا عدم اس کے وجود پر مقدم رہا ہو۔ قدیم۔ وہ موجود ہے جس کے وجود پر عدم کا تقدم فرض نہ کیا جا سکتا ہو۔

## 8-صادق

(ا) اللہ تعالیٰ کا ہر قول و فعل صدق و راستی پر مبنی ہے۔ صدق و راستی کمال ہے۔ خداوند عالم ہر لحاظ سے کامل اور ہر کمال سے متصف ہے۔

(ب) جھوٹ کا ارتکاب جہالت یا عجز کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نہ عاجز ہے نہ جاہل۔

(ج) کذب نقص بھی اور قبیح بھی ہے۔ اللہ ناقص نہیں ہے اور اس کا دامن ربوبیت تمام قبائح و شنائع کی آلودگیوں سے منزہ و مبرا ہے۔

(د) اگر اللہ صادق (معاذ اللہ) نہ ہو تو شرائع و تکالیف (اصول دین و فروع دین) سب بیکار ہو جائیں گے اور آخرت میں ثواب و عذاب کے وعدہ پر وثوق نہیں رہے گا جبکہ معاد (آخرت) اصول دین میں شامل ہے۔ جس کے مانے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔

## 2-صفاتِ اضافیہ (اعتباریہ)

جیسے خالقیت، رازقیت، ربوبیت، اماتت، احیاء وغیرہ یہ صفاتِ اضافیہ ہیں۔

امر مکرر کو اضافہ کہتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا رازق ہے۔ خالق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مخلوق بھی ہے جس کو اس نے خلق کیا ہے۔ جس کو وہ رزق دیتا ہے۔ جن کو مارتا ہے۔ جلاتا ہے۔

ان صفات کو صفاتِ اضافیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا دوسرا سرا ہم خود ہیں ہمیں رزق ملتا ہے تو آخر یہ رزق کون دیتا ہے۔ ہم مخلوق ہیں۔ آخر یہ خلق کون کرتا ہے؟ اس صفت رازقیت وصفت خالقیت کو صفت اضافیہ (اعتباریہ) کہتے ہیں۔ صفاتِ ثبوتیہ (حقیقیہ) یہ عین ذات وصفت کمال ہیں۔ صفت اضافیہ اعتباریہ یہ غیر صفاتِ کمال ہیں۔ یہ صفاتِ اضافیہ صفاتِ ثبوتیہ مثلاً (علم وقدرت) کی طرف راجع بھی ہوسکتی ہیں اور صفاتِ اضافیہ بھی ہوسکتی ہیں۔

ہاں یہ صفاتِ اضافیہ صفاتِ ثبوتیہ کی طرف راجع ہوں۔ جیسے قدرت علی الخلق (قدرت صفت ثبوتیہ ہے) قدرت علی الرزق وقدرت علی الربوبیت وقدرت علی الاماتۃ۔ (مارنا) وقدرت علی الاحیا (جلانا) کے لحاظ سے یہ صفات عین ذات وصفاتِ حقیقیہ کہلاتی ہیں۔

اور مخلوق (خلق کیا ہوا) کے اعتبار سے خالق۔ مرزوق (رزق دیا ہوا) کے اعتبار سے رازق مربوب (تربیت دیا ہوا) کے اعتبار سے رب۔ زندہ کو مردہ مردہ کو زندہ کرنے کے اعتبار سے محیی (زندہ کرنے والا) وممیت (مارنے والا) یہ صفات نہ عین ذات ہیں اور نہ صفاتِ حقیقیہ (ثبوتیہ) ہیں اور نہ صفات حقیقہ کہلانے کی مستحق ہیں۔ کیونکہ ان صفات میں اعتبارات ملحوظ ہیں۔ (یعنی ان صفات میں اضافتیں ہیں) یہ صفاتِ اضافیہ کہلاسکتی ہیں اور صفاتِ اعتباریہ کہی جاسکتی ہیں۔ پس جب کوئی مخلوق و مرزوق ومربوب ومردہ وزندہ موجود ہی نہ تھا تو باری تعالیٰ کو اس اعتبار سے نہ خالق کہا جاسکتا تھا اور نہ رازق۔ نہ رب نہ ممیت (مارنے والا) نہ محیی (زندہ کرنے والا) یہ صفاتِ اضافیہ ہیں۔

یہ صفاتِ اضافیہ قدرت (صفت ثبوتیہ) کی طرف راجع ہونے کے لحاظ سے عین ذات ہیں اور صفاتِ ثبوتیہ حقیقہ ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ قدرت علی الرزق اور قدرت علی الخلق کے اعتبار سے صرف خداوند عالم ہی رازق و خالق ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے غیر اللہ کو خالق و رازق نہیں جا سکتا۔

مگر صفت اعتبار یہ جو اللہ کی عین ذات نہیں ہیں اور نہ صفاتِ کمال ہیں یہ صفات غیر اللہ کے لئے ثابت ہیں۔ جیسے جناب عیسیٰؑ کو ان پرندوں کے اعتبار سے خالق کہنا جن کو جناب عیسیٰؑ مٹی سے بنایا کرتے تھے بے محل نہیں ہوگا۔

جیسے فرمایا۔ انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ لا الطیر فانفخ فیه فیکون طیرا باذن الله. وللبرئ الاکمه والابرص واحی الموتی باذن الله۔ (سورہ آل عمران پ 30 آیت 49)

میں تمہارے لئے گارا..... مٹی سے پرندے کی شکل و صورت پیدا کر دوں گا۔ پھر اس میں پھونک ماروں گا تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جائے گا اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کر دوں گا اور میں حکم خدا سے مردوں کو زندہ کر دوں گا اور زندہ کئے اور پرندے بنائے۔ اسی لئے خداوند عالم نے قرآن میں خود کو احسن الخالقین اور احسن الرازقین و خیر الناصرین فرمایا: ''آیات کریمہ سے واضح ہے کہ خالق و رازق اللہ کے علاوہ اور بھی ہیں مگر اسی لحاظ سے جن کا تذکرہ ہو چکا۔ یعنی مخلوق کے اعتبار سے خالق۔ مرزوق کے اعتبار سے رازق۔ منصور کے اعتبار سے ناصر۔ مزید تشریح آئیگی۔

## 3-صفاتِ سلبیہ

یہ وہ صفات ہیں جو خدا تعالیٰ کے لئے نقص اور عیب ہیں۔ اس لئے ہم ان صفتوں سے خدا کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا مرکب نہیں ہے۔ مجسم، عاجز، مرئی جوہر و عرض نہیں ہے۔

خدا تعالیٰ کی پہچان۔ صفاتِ اضافیہ اور صفاتِ سلبیہ ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ صفاتِ حقیقہ جو صفاتِ کمال ہیں ہم ان کو نہیں پہچان سکتے۔ اس لئے کہ ہم خود ناقص اور محدود ہیں۔ ناقص کامل کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ محدود لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

صفات سلبیہ بھی آٹھ ہیں۔ ان صفات کو صفاتِ جلال کہا جاتا ہے۔

1-لاشریک ہے۔ 2-مرکب نہیں ہے۔
3-جسم جوہر و عرض نہیں ہے۔ 4-محل حوادث نہیں۔
5-حلول نہیں۔ 6-مرئی نہیں۔
7-محتاج نہیں۔ 8-لذت و الم (کیفیات) نہیں۔

صفات سلبیہ وہ ہیں جن کا خالق سے انکار لازم ہے اور انکار نہ کرنا شرکِ جلی ہے۔

### 1-لاشریک

شریک نہیں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے جس پر دلیل سمعی و دلیل تمانع قائم ہے۔

(ا) شریک موجود ہونے کی صورت میں نظامِ عالم درہم و برہم ہو جاتا ہے۔

(ب) شریک موجود ہونے کی صورت میں ترکیب لازم آئے گی۔

## 2- مرکب نہیں ہے

اللہ تعالیٰ مرکب نہیں، مرکب اجزاء کا محتاج ہوتا ہے محتاج ممکن ہوتا ہے اللہ تعالیٰ واجب الوجود مرکب کی نقیض بسیط ہے اللہ تعالیٰ بسیط حقیقی ہے۔ بسیط وہ ہے جس کا جزو نہ ہو۔

ترکیب کی دو قسمیں ہیں۔ ذہنی، خارجی

## ترکیب ذہنی

ترکیب ذہنی کی دو قسمیں ہیں۔

1- ترکیب وہمی۔

2- ترکیب عقلی۔

## ترکیب وہمی

وہ ہوتی ہے کہ قوتِ واہمہ کے نزدیک (جو کہ جزئیات کو درک کرتی ہے) اجزاء ہوں۔ جیسے قوتِ واہمہ میں ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ اجزاء رکھتے ہیں۔ اس کو ترکیب وہمی کہتے ہیں۔

## ترکیب عقلی

جو عقل کے نزدیک اجزاء ہوں جیسے انسان کے اجزا عقل کے نزدیک جنس و فصل ہیں۔ جس جو حیوان و انسان میں مشترک ہے۔ فصل۔ جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔

## ترکیب خارجی

ترکیب خارجی کی دو اقسام ہیں۔

1-ذی مادہ اشیاء کی ترکیب۔

2-غیر ذی مادہ کی ترکیب۔

## ذی مادہ اشیاء کی ترکیب

ذی مادہ اشیاء دو اقسام۔شی دو چیزوں سے مرکب ہو جیسے۔دوا کی معجون۔ شربت وغیرہ یا ایک شی سے مرکب ہو۔یعنی شی کی ترکیب ایک ہی قسم کی ہو گی جیسے۔ کوئی چیز مادہ وصورت سے مرکب ہو۔

## غیر ذی مادہ اشیاء کی ترکیب

جو چیزیں عالم مجردات سے تعلق رکھتی ہوں۔ان کی ترکیب ذات اور وجود سے ہوتی ہے۔اصطلاحاً کہتے ہیں کہ یہ چیز مادیت اور وجود سے مرکب ہے۔ (اللہ کے ہاں یہ تمام تراکیب نہیں ہے۔یہ اس کی ذات کے لئے محال ہیں۔لہٰذا اللہ مرکب نہیں ہوسکتا۔)

## 3-جسم نہیں ہے

نہ وہ جسم ہے نہ عرض وجوہر ہے۔ورنہ مکان کی احتیاج لازم آئے گی۔جسم وہ جوہر ہے جس میں طول وعرض وعمق پایا جائے۔عرض وہ ہے جو جسم میں حلول کئے ہوئے ہو اور بغیر جسم عرض کا وجود نہیں ہوتا۔جوہر اپنے کمال میں عرض کا اور عرض اپنے

وجود میں جوہر کا محتاج ہوتا ہے اور یہ احتیاج ممکن کے خواص و آثار میں سے ہے۔ جو محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں ہوسکتا۔

## 4- محل حوادث نہیں ہے

اللہ تعالیٰ محل حوادث نہیں ہے کیونکہ باری تعالیٰ کا غیر سے متاثر ہونا محال ہے۔ یہ نقص ہے نقص محال ہے۔

(ا) خداوند عالم پر وہ حالات طاری نہیں ہوتے جو مخلوق پر طاری ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے خواب بیداری، حرکت و سکون، جوانی پیری، صحت، بیماری وغیرہ۔ یہ تمام امور جسم و جسمانیات کے لوازم و آثار ہیں وہ جسم و جسمانیات سے مبرا و منزہ ہے لہٰذا محل حوادث نہیں ہوسکتا۔

## 5- حلول نہیں کرتا

(ا) خدا تعالیٰ کسی شی میں حلول نہیں کرتا۔ جیسے کوزے میں پانی یا نصاریٰ کا عقیدہ عیسیٰؑ کے بارے میں حلول کرنے والا محل کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ احتیاج ممکن کے خواص میں سے ہے اللہ واجب الوجود کسی چیز کا محتاج نہیں ہوسکتا۔

(ب) حلول میں حال کے لئے جوہر یا عرض ہونا ضروری ہے۔ جیسے پھول میں خوشبو۔ آگ میں حرارت۔ اللہ تعالیٰ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے۔

## 6- مرئی نظر آنے والا نہیں ہے

اللہ تعالیٰ ان ظاہری آنکھوں سے دنیا و آخرت میں دیکھا نہیں جا سکتا۔

لاتدرکہ الابصار ولن ترانی۔

(1) مرئی (نظر آنے والے) کا کسی جہت میں ہونا ضروری ہے کیونکہ مرئی دیکھنے والے کے مقابل ہوگا یا حکم مقابل میں ہوگا۔ پس جسم ہو جائے گا۔ جسمیت باری تعالیٰ کے لئے محال ہے۔

دیکھنے کے لئے 6 چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

-1 وہ چیز دیکھنے والے کی جہت مقابل میں ہو۔

-2 کوئی شکل وصورت رکھتی ہو۔

-3 کوئی رنگ بھی رکھتی ہو۔

-4 کسی مکان میں ہو۔

-5 چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

-6 دیکھنے والے اور اس میں زیادہ فاصلہ نہ ہو اسی طرح درمیان میں کوئی چیز حائل بھی نہ ہو۔ روشنی ہو تاریکی نہ ہو۔ یہ تمام صفات جسم وجسمانیات کے ہیں۔ اللہ ان سے مبرا ومنزہ ہے۔

## 7-محتاج نہیں

(ا) خدا تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں کسی زمان و مکان آلات اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ احتیاج غیر نقص وعیب ہے۔

(ب) احتیاج ممکن کے خواص وآثار میں سے ہے۔ واجب الوجود وہ ہوتا ہے جو صمد وغنی (سب سے بے نیاز ہو) احتیاج میں وہ واجب نہیں رہتا۔

## 8-لذت والم

(خوشی غمی) رضا وغضب نہیں ہے۔ یعنی کیفیات نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لذت والم (رضا وغضب) کیفیات نہیں ہیں کیونکہ کیفیات کا تعلق مزاج سے ہوتا ہے۔ خالص کے لئے مزاج محال ہے۔ لذت: موافق طبیعت شی کے ادراک کا نام لذت ہے۔ الم مخالف طبیعت شی کے ادراک کا نام الم ہے۔ لذت والم حسی اور کبھی عقلی ہوتے ہیں۔ حواس خمسہ ظاہرہ سے ہوں تو لذت والم حسی کہلاتے ہیں۔ اگر حواس خمسہ باطنیہ (حس مشترکہ۔ قوتِ خیالیہ۔ قوتِ واہمہ۔ قوتِ حافظہ۔ قوتِ متصرفہ کے ذریعہ ہوں تو لذت عقلیہ والم عقلی کہلاتے ہیں۔ یہ حسی ہوں یا عقلی دونوں اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہیں۔

علم قدرت' حیات' ارادہ خدا صفاتِ ثبوتیہ ہیں جو حقیقی ہیں۔ یہ صفتیں عین ذاتِ خدا ہیں یعنی علم خدا وہ علم ہے جو لامتناہی ہے۔ قدرتِ خدا وہ قدرت ہے جو لامحدود ہے۔ حیاتِ پروردگار وہ حیات ہے جو غیر متناہی ہے۔ اسی طرح ذات باری تعالیٰ بھی غیر متناہی ہے۔ وہ ہم انسانوں کی طرح نہیں ہے۔ پس ہمارا علم ہماری قدرت زائد بر ذات ہیں۔ اس لئے ہم دراصل عالم نہیں ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے بعد تھوڑا سا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ دراصل ہمارے پاس قدرت نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ ہم کو قدرت وتوانائی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ خدا کا علم اور اس کی قدرت ذاتِ خدا کی طرح لامتناہی ہیں۔ کوئی صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کی ذات وصفت کو کما حقہ نہیں سمجھ پاتے۔

ہم پھر بیان کرتے ہیں کہ ہمارے لئے خدا کی معرفت صرف صفت اضافیہ اور صفت سلبیہ کے ذریعہ ممکن ہے چونکہ صفاتِ اضافیہ میں ہم خود طرفِ اضافت (دوسرا سرا) ہیں۔ اس لئے کہتے ہیں کہ ہم حادث ہیں ہر حادث کو ایک محدث کی ضرورت ہے ہم کو رزق دیا جاتا ہے لہٰذا ہمیں ایک رازق کی ضرورت ہے۔ ہمیں تربیت دینا ضروری ہے لہٰذا ایک مربی کی ضرورت ہے۔ ہمیں مدد چاہے ایک ناصر کی ضرورت ہے۔ الخ

صفاتِ سلبیہ کے ذریعہ خدا کو پہچاننے کا ذریعہ یہ ہے کہ چونکہ ہم اپنی کمی اور نقص وعیب کو درک (سمجھ) کر سکتے ہیں جیسے۔ عاجزی' احتیاج مرکب ہونا یا مجسم (جسم والا ہونا) مرئی۔ نظر آنا۔ وغیرہ اس لئے ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ خدا میں یہ کمی نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن صفاتِ حقیقہ (ثبوتیہ) ذاتِ خدا کی طرف وہ ہمارے فہم و فراست کی درست رس سے باہر ہیں۔ ہم ان کی کہنہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کہ ہم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

جن لوگوں نے خدا کی صفات حقیقہ کی توضیح کی کوشش کی ہے وہ دانستہ یا نا دانستہ طور پر بھٹک گئے ہیں یا ان سے بہت ہی فاش غلطی سرزد ہوئی ہے۔ جن میں اشاعرہ ومعتزلہ سرفہرست ہیں اور بعض الہیّی فلسفی بھی ان میں شامل ہیں۔

توحید سمجھنے کیلئے اور موحد بننے کے لئے صفات سلبیہ میں غور وفکر کرنا ضروری ہے۔ انہی صفات کے ذریعہ ہم توحید کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

نہج البلاغۃ: جناب علی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ ما وحدہ من کیفیہ وہ موحد نہیں ہے جو خدا کے لئے کیفیات کا قائل ہو جائے۔ اس لئے کہ تمام کیف اعراض

ہیں اور خدا نہ جسم ہے نہ عرض۔

## فلاسفہ نے کیف کی 4 اقسام کی ہیں۔

1- کیفیات محسوسہ۔ 2- استعدادیہ۔
3- نفسانیہ۔ 4- کمیۃ۔

### 1- کیفیات محسوسہ

وہ کیفیتیں جو حواس خمسہ (ذائقہ، سامعہ، لامسہ، باصرہ، شامہ) کے ذریعہ محسوس کی جاتی ہیں۔ جیسے رنگ جو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے یا کسی چیز کی نرمی، سختی، حرارت و برودت ہاتھوں کے ذریعہ محسوس ہوتی ہے۔

### 2- کیفیات استعدادیہ

وہ چیزیں جن میں متاثر اور منفعل ہونے کی قوت ہو یا نہ مثلاً ہم کہتے ہیں فلاں شی نرم ہے وہ دب سکتی ہے یا فلاں چیز سخت ہے نہیں دَب سکتی یا یہ کہتے ہیں کہ فلاں ضعیف المزاج ہے۔ بیمار ہونے کی استعداد اس میں موجود ہے یا یہ کہتے ہیں کہ فلاں قوی المزاج ہے اس میں جراثیم اور حوادثات سے بچنے کی قوت پائی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کو کیفیات استعدادیہ کہتے ہیں۔

### 3- کیفیات نفسانیہ

وہ صفتیں جو نفس انسان میں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے آدمی عالم نہیں ہوتا بعد میں علم حاصل کرتا ہے یا قدرت نہیں رکھتا بعد میں صاحب قدرت بنتا ہے۔ یہ قدرت و علم

وغیرہ جوانسان کے نفس میں پیدا ہو جاتے ہیں انہیں کیفیات نفسانیہ کہتے ہیں۔ جیسے راضی ہونا ناراض ہونا۔ خوشی وغمی کیفیات نفسانیہ ہیں۔

## 4- کیفیات کمیّہ

یہ وہ کیفیتیں ہیں جو مقدار پر عارض ہوتی ہیں۔ جیسے خط سطح اور جسم تعلیمی یہ کم ہیں۔ لیکن ان میں ایک کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کیفیتوں کو 'کم' سے مختص کیفیت کہتے ہیں۔ مثلاً: ایک جسم جو مثلث ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مربع یا ذوزنقہ ہو جائے۔ یا جسم تعلیمی کی سطح جو کبھی مثلث اور کبھی مربع ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیات کمیات سے مخصوص ہیں۔ یہ تمام کیفیات ذاتِ خدا پر عارض نہیں ہوتیں کیونکہ یہ تمام زائد برذات ہیں۔ اگر خدا سے نسبت دی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ چیزیں اس کے پاس نہیں تھیں کسی دوسرے نے یہ ساری چیزیں اسے عطا کی ہیں۔ ایسی صورت میں ایک ایجاد کرنے والے کی ضرورت ہوگی۔ جو یہ صفتیں خدا کو عطا کرے اور کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو ان باتوں کا قائل ہو یا اس کا دعویٰ کرے۔ اسی وجہ سے جناب امیر المومنین ؑ فرماتے ہیں۔ ماوحدہ من کیفہ۔ یعنی وہ مشرک ہو جائے گا جو خدا کے لئے کیفیتوں کا قائل ہو جائے۔ اس لئے کہ کیف عرض ہے اور اعراض زائد برذات ہوتے ہیں۔

اگر کوئی خدا کے لئے کیف کا قائل ہو جائے اور کیف کو ذات کی طرح قدیم جانتا ہو تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایک ذات قدیم ہو اور ایک کیفیت قدیم ہو۔ یعنی دو قدیم ہوں۔ جیسے کہ اشاعرہ نے کہا۔ اس تعدد قدماء لازم آتا ہے۔ جو محال ہے محال جس سے لازم آئے وہ خود محال ہوتا ہے۔ لہٰذا کیفیت ذات خدا کے لئے محال ہے۔

اسی نکتہ کو حضرت علی علیہ السلام نے اپنے پہلے خطبے میں بیان فرمایا ہے فرماتے ہیں فمن وصف الله سبحان فقد قرنه جوخدا کے لئے ایسی صفت کا قائل ہو جیسی ہمارے اندر پائی جاتی ہے جیسے علم۔قدرت کیف (سفیدی سیاہی' درازی 'کوتاہی وغیرہ) تو یہ صفتیں ہماری ذات پر زائد ہیں۔ایسی صفتوں کا خدا کی ذات میں قائل ہونا خدا کی ذات میں الگ سے ان صفتوں کا لانا ہے اور اس طرح تعبیر کرنا ہے کہ ایک تو خدا کا وجود ہے اور الگ سے اس میں علم بھی ہے۔الگ سے اس میں قدرت بھی ہے۔وغیرہ

ومن قرنه فقد ثناه اور اگر ایسی چیزوں کو خدا کا قرین (ساتھی) قرار دیا تو دوگانگی کے قائل ہو گئے اور یہ شرک ہے بالکل اسی طرح جس طرح عیسائی اقانیم ثلاثہ (باپ بیٹا' روح القدس) کے قائل ہیں یا اشاعرہ ''قدماء ثمانیہ'' کے قائل ہیں۔

لشهادة كل صفة انها غير الموصوف وشهادة كل موصوف انه غير الصفت اس لئے کہ ہر صفت گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف سے الگ ایک چیز ہے اور ہر موصوف شہادت دیتا ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔لہٰذا اگر کوئی علم' قدرت' حیات کو زائد بر ذات مانے تو یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ درحقیقت صفاتِ خدا عین ذات ہیں یعنی (وہی ذات عین علم وعین قدرت اور عین حیات ہے) یہاں پر حدیث مبارک بیان کرتے ہیں تا کہ یہ مطلب صاف وواضح ہو سکے۔(بحار الانوار ج 3 ص 304 منقولہ از کفایت النصوص)

ابوالفضل شیبانی اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے اس کی سند ابن عباس تک لے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں! قدم يهودي على رسول الله ایک یہودی پیغمبرؐ

اسلام کی خدمت میں آیا۔ فقال یا محمد انی اسئلک عن اشیاء تلجلج فی صدری منذحین۔ اس نے کہا کہ میرے دل میں ایک ہے جو بہت دنوں سے کھٹک رہی ہے وہ میں آپؐ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

فان انت اجیتنی عنها اسلمت علی یدک۔ اگر آپؐ اس کا جواب دے دیں تو میں آپ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کرلوں گا۔

حضرتؐ نے فرمایا اسئل یا ابا عمارہ۔ اے ابوعمارہ پوچھو۔

فقال یا محمدؐ صف لی ربک۔ اس نے کہا کہ آپؐ ہمارے اپنے رب کی توصیف بیان کریں۔

آپؐ نے فرمایا: ان الخالق لایوصف الایما وصف به نفسه۔ وہ خدا جو تمام موجودات کا پروردگار ہے قابل توصیف نہیں ہے مگر ان چیزوں کے ذریعہ جن سے خود اس نے اپنی توصیف کی ہے۔ (وہ صفات صفاتِ کمال ہیں اور صفاتِ کمال عین ذات ہیں)

اس مقام پر ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ فلاسفہ حکمت متعالیہ کی بحث میں کہتے ہیں۔

عالم میں حقیقت وجود کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تمام ماہتیں امورِ اعتباری ہیں عدم تو کچھ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا حقیقت بس ہستی ہے۔ اس لئے صفاتِ کمال جو حقیقت ہیں۔

"ان کی بازگشت حقیقت ہستی کی طرف ہوتی ہے۔"

یہ حقیقت مذکورہ بالا مطلب کی دلیل ہے اور وہ اس طرح کہ حقیقت ہستی و وجود تمام حقائق کمالیہ کی بہ نسبت مساوی ہے۔ حقیقت ہستی عین علم وقدرت وحیات

ہے۔ اس لئے جو صفات۔ صفاتِ کمالیہ ہیں ان کی بازگشت حقیقت ہستی کی طرف ہوتی ہے۔

خدا ان تمام صفتوں کا حامل ہے (جامع) اور یہ تمام صفتیں عین ذات ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی خدا کی ذات پر زائد بر ذات کا قائل ہو تو وہ مشرک ہے۔ حضور پاکؐ نے توحید کے بارے جو ارشاد فرمایا روایت اسے یوں بھی بیان کرتی ہے۔ فرمایا: **وکیف یوصف الخالق الذی یعجز الحواس ان تدرکه والاوهام ان تناله والخطرات ان تحده**۔ اس خالق کی توصیف انسان کیسے بیان کر سکتا ہے حواس اور اوھام جسے درک کرنے سے عاجز اور دل میں آنے والے خیالات پروردگار عالم کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔

دریا کوزے میں نہیں سمویا جا سکتا۔ بس اسی طرح لامحدود خدا ہماری محدود فکر میں (جو خدا ہی نے پیدا کی ہوئی ہے) نہیں آ سکتا۔

**والابصار عن الاحاطة به**۔ آنکھیں اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں اور بات تو دراصل یہ ہے کہ خدا جسم ہی نہیں ہے جسے آنکھیں دیکھ سکیں۔

**جل عما یصفه الواصفون**o خدا توصیف کرنے والوں کی توصیف سے منزہ ہے صفات ثبوتیہ کو صفاتِ کمال و جمال اور صفاتِ سلبیہ کو صفات جلال کہتے ہیں۔ صفاتِ جلال کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان صفتوں سے منزہ ہے۔

**نای فی قربه** نزدیک ہونے کے بعد دور ہے۔

قرآن میں اس نے خود ہی فرمایا ہے **نحن اقرب الیه من حبل الورید**o (سورہ ق) ہم شہ رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

لیکن اتنی قربت کے بعد بھی وہ دور ہے۔ اس لئے کہ ہم میں سے کوئی بھی اتنی قربت کے باوجود اس کو درک نہیں کر سکتا۔

وقرب فی نابہ اور دور ہونے کے باوجود قریب ہے۔

وھو معکم اینما کنتم۔ (قرآن) تم جہاں کہیں بھی رہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ہاں تم اس کا درک نہیں کر سکتے۔

کیف الکیفیة۔ یہ کیفیتیں اپنی مختلف قسموں کے ساتھ اسی کی پروردہ ہیں اور خدا ان کیفیتوں کا خالق اور ایجاد کرنے والا ہے۔

فلا یقال لہ کیف۔ لہٰذا اس کے لئے (یعنی اللہ کیلئے) کیف کی لفظ نہیں بولی جا سکتی کیف کا مطلب یہ ہے کہ وہ (خدا) کیسا ہے؟ اور خدا جسم نہیں ہے کہ پوچھا جائے کہ وہ کیسا ہے۔

واین الاین۔ مکان تو مخلوق خدا ہے۔

فلا یقال لہ این؟ لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خدا کہاں ہے۔ وہ زمان و مکان کا خالق ہے لہٰذا زمان سے بالاتر ہے۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟

وھو منقطع الکیفوفیة والاینونیة۔ وہ کیف اور این سے جدا ہے۔

والواصفون لا یبلغون نعتہ۔ توصیف کرنے والے اس کی کنہ صفات تک نہیں پہنچ سکتے۔

فھو الاحد الصمد۔ وہ یگانہ ہے کسی قسم کا کوئی نقص اس کی ذات میں نہیں ہے۔

**کما وصف نفسه**۔ جیسا کہ اس نے خود ہی اپنا وصف قرآن میں بیان کیا ہے۔

**الصمد**۔ کے مختلف معانی علماء نے ذکر کیے ہیں۔ ان میں ایک معنی یہ بھی ہے کہ صمد مقصود موجودات کو کہتے ہیں یعنی تمام موجودات اپنے کمال کے سلسلہ میں اسی کے محتاج ہیں۔ ایک معنی یہ بھی ہے کہ ذاتِ حق میں کوئی خلاء نہیں ہے وہ ہر نقص وعیب سے پاک ہے۔

**لم یلدو لم یولد ولم یکن له کفوا احده** قرآن۔ نہ تو اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے اور نہ کوئی اس کا کفو ہے۔

جب یہودی نے ان باتوں کو سنا تو کہنے لگا **صدقت یا محمدؐ**۔ آپ نے صحیح فرمایا۔

پھر اس نے پوچھا۔ **اخبرنی عن قولک واحد لاشبیه له. الیس الله واحد والانسان واحد. فوحدانیته اشبهت وحدانیة الانسان**۔ آپؐ جو یہ فرماتے ہیں کہ خدا واحد ہے تو انسان بھی تو واحد ہے۔ لہٰذا خدا کی وحدانیت۔ انسان کی وحدانیت کی شبیہ ہوگی؟

تو آپؐ نے فرمایا تو واحد کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کر رہا ہے۔ خدا کی وحدانیت کی حقیقت ہماری اور تمہاری وحدانیت کی حقیقت سے جدا ہے انسان واحد ہے یعنی نوع واحد ہے اور خدا واحد ہے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی حقیقت ہے جس کے بارے میں شبیہ اور مثل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ذات احدی ہے۔ یعنی اس کی ذات بسیط ہے مرکب نہیں ہے۔

فقال الله واحد واحدی المعنی. والانسان واحد ثنوی للمعنی۔ فرمایا۔ وہ واحد ہے اس کی ذات ذات احدی ہے یعنی وہ مرکب نہیں بلکہ بسیط حقیقی ہے اور انسان واحد دوگانہ ہے یعنی عدد کے اعتبار سے واحد ہے لیکن مختلف عنوان سے اس میں دوئی پائی جاتی ہے۔

جسم، عرض، بدن، روح انسان جسم وعرض وبدن وروح سے مرکب ہے۔ لہٰذا انسان کی ذات میں ترکیب اور دوئی پائی جاتی ہے لیکن خدا کی ذات میں کسی قسم کی ترکیب اور دوئی کا وجود نہیں ہے۔ فانما التشبیه فی المعانی۔ لہٰذا مفہوم وحدت معنائے ذہنی کے اعتبار سے دونوں پر منطبق ہوتا ہے اور کسی دوسرے اعتبار سے منطبق نہیں ہوتا۔ قال صدقت یا محمدؐ! اور یہودی نے کہا آپ صحیح فرماتے ہیں اور اسلام قبول کرلیا۔

☆☆☆☆☆

# درس سوم

رَفِیْعُ الدَّرَجَات ذُوالْعَرْشِ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقo (پارہ نمبر 24 آیت نمبر 15 سورہ المومن)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ درجات کا بلند کرنے والا عرش والا ہے یعنی صاحب عرشِ علم تقدیر وتدبیر ہے۔ وہ اپنے عالم امر سے ایک خاص روح اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے تا کہ وہ شخص اس روح (امری) کے ذریعہ روز قیامت سے ڈراتا رہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا آخری کلام اور آخری پیغام کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔ اس لئے جو کچھ اس میں کہہ دیا گیا ہے اسے قیامت تک باقی رہنا ہے۔ ہر امر و نہی قیامت تک ہوگی۔ نیز مدح و مذمت بھی قیامت تک باقی ہوگی۔ کیونکہ اس کے بعد قدرت کو نہ کچھ کہنا ہے اور نہ کچھ بھیجنا ہے۔ لہٰذا ہر آیت جس مسئلہ کے بارے میں بھی ہو حرفِ آخر ہے۔ قرآن کی محدود عبارت لامحدود مفہوم و معانی کی حامل ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے۔ اَلْقُرآنُ لَهٗ ظَهْرٌ وَلَهٗ بَطْنٌ قرآن کا ایک ظاہر ہے

اور ایک باطن ہے۔ ولبطنہ بطن اور اس کے باطن کا ایک باطن ہے۔

بل الی سبعۃ ابطن۔ بلکہ سات باطن ہیں۔

بل الی سبعین بطن۔ بلکہ ستر باطن ہیں۔

پھر ارشاد فرمایا: ما من حرف فی حروف القرآن الا لہ سبعون الف معنی۔ حروف قرآن میں سے کوئی حرف ایسا نہیں ہے جس میں کم از کم ستر ہزار معانی نہ ہوں۔

ہم اپنی کم علمی اور ناسمجھی کی بنا پر حیران ہونے لگیں کہ یہ کیسے ممکن ہے الگ بات ہے۔

مفسرین نے اس آیہ مجیدہ کا ترجمہ یوں کیا ہے رفیع الدرجات۔

(1) یعنی اللہ بڑے درجوں والا ہے۔

(2) بڑے عالی درجہ والا ہے قرآن مجید میں لفظ فطرت ایک مقام پر آئی ہے اور اس کے مشتقات متعدد آیات میں موجود ہیں۔ مثلاً فطرھن۔ سورہ روم فطر السمٰوٰت والارض. سورہ انعام۔ واذ السماءُ انفطرت سورہ انفطار۔ والسماء منفطر بہ وکان وعدہ مفعولاً۔ (سورہ مزمل پ 29)

ان میں ہر ایک مفہوم سے مراد تخلیق نو ہے۔ لفظ فطرت قرآن مجید میں صرف ایک آیت میں آئی ہے۔

فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ۔

عربی زبان میں فعلہ کا وزن نوعیت کو بتاتا ہے ظاہر کرتا ہے۔ یعنی ایک خاص

طرز کی طرف اشارہ کرتا ہے جیسے جَلَسَ کے معنی بیٹھنے کے ہیں مگر کبھی کبھی اسی جَلَسَ کو ہم جِلسَۃُ کہتے ہیں یعنی ایک خاص ڈھب سے بیٹھنا۔ مثلاً ہم اس طرح کہیں۔ جَلَسْتُ جِلسۃَ زیدٍ کہ میں زید کے بیٹھنے کی طرح بیٹھا۔ لہٰذا فطرت کا استعمال انسان کے حوالے سے موجود ہے۔ اور اسے دین سے جوڑا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فطرت اللّٰہ التی فطر اللّٰہ ایک خاص نوعیت سے اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔

ہاں۔ اگر ہم انسان کی اصل خلقت میں کچھ ذاتی خصوصیات کے قائل ہوں تو یہ ذاتی خصوصیات وہی فطرتِ انسانی ہوں گی۔

مشہور و معروف کتاب نہایۃ۔ نہایہ لغت کی اچھی کتاب ہے اور اس میں لغاتِ حدیث کی اچھی تشریح کی گئی ہے۔ جس طرح مفرداتِ راغب میں کلماتِ قرآن کی اچھی تشریح ملتی ہے۔ چنانچہ ابن اثیر اس حدیث کے ذیل میں کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام الخ ہر نوزائیدہ ابتداً اصول فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے جسے بیرونی اسباب فطرت کے راستے سے دور کر دیتے ہیں یعنی اسے یہودی مجوسی نصرانی بنا دیتے ہیں۔ ابن اثیر نے فطرت کی اس طرح وضاحت کی ہے۔ الفطرۃ الابتداء والاختراعُ والفطرۃ الحالۃ منھا۔ فطرت کا مفہوم ابتداء اور اختراع ہے۔ یعنی آغاز تخلیق۔ جسے ابداع کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھیے کہ فطرت یعنی ایسی اختراع یا ایجاد جو نقل و تقلید کے بالمقابل ہو۔

دراصل خدا کا کام بغیر کسی کی پیروی کئے کارِ تخلیق انجام دینا ہے۔ جبکہ انسان کی تخلیق کا عمل عموماً نقالی و پیروی کا رہین منت ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان جس کام کو اپنی اختراع اور ایجاد کہتا ہے اس میں بھی در پردہ تقلید ہی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ ''فطر'' کے معنی عمل غیر تقلیدی کے ہیں۔

ابن اثیر کا بیان: الفطرة الحالة منه كالجِلسة والركبة۔

فطرت۔ایک خاص نوعیت سے بیٹھنا اور اٹھنا ہے۔

والمعنى انه يُولد على نوعٍ مِن الجبِلّةِ والطبع المتهيةِ لِقبولِ الدينِ o فلو تَرَكَ عليها لَاسْتَمَرَّ على لزومِها۔

یعنی انسان ایک خاص سرشت کے ساتھ پیدا ہوا ہے جس میں دین قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔یعنی اگر انسان کو اس کی طبعی حالت پر زندگی گزارنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو وہ دین ہی کے فطری راستہ کو اختیار کرے گا۔مگر ہوتا یہ ہے کہ خارجی اثرات اسے فطرت کے راستے سے منحرف کر دیتی ہے۔

كلّ مَولودٍ على فطرة الاسلامُ ابواه يُهَوّدانه وينصّرانه يمجّانِه۔

ایک حدیث میں فطرت کو دین کے معنی میں استعمال کیا گیا۔ابن اثیر حضرت علیؑ سے حدیث نقل کرتا ہے۔ وَجَبَّارالقلوب علٰی فطرتھا۔خدا برتر نے دلوں کو فطرت کی بنیاد پر پیدا کیا۔مذکورہ حدیث میں فطرت کو جمع فطرات کی صورت استعمال کیا گیا۔یہاں دلیل قائم کر سکتے ہیں کہ علوم و اصطلاحاتِ اسلامی کے لحاظ انسان ''فطریات'' کا حامل ہے۔فطرت کی لفظ قرآن نے سب سے پہلے انسان کے بارے میں استعمال کی ہے۔ابن عباس جو قریش کے مشہور دانشمند عرب تھے وہ عربی ادب سے خوب واقف و باخبر بھی تھے خود فرماتے ہیں۔

ما كنتُ ادری ما فطر السمٰوٰت والارض حتی۔

کہ مجھے فاطر کے معنی کا علم نہیں تھا۔ یعنی فاطر کی لفظ جو قرآن میں آئی ہے میں سمجھ نہ سکا۔ یہاں تک کہ دو بادیہ نشین (عربی بدو) جو ایک کنوئیں کی ملکیت پر جھگڑتے ہوئے میرے پاس آئے اور ان میں سے ایک نے کہا: انا فطرتُھا۔ میں نے اسے کھودا ہے۔ (ہوتا یہ ہے کہ کنواں کھودنے کے بعد جو پانی نکلتا ہے وہ کچھ دنوں کے بعد پھر زمین کے اندر چلا جاتا ہے تو دوبارہ اسے تھوڑا سا کھودا جاتا ہے یہاں تک کہ پانی اچھی طرح نکلنا شروع کر دیتا ہے) عرب کہنا یہ چاہتا تھا کہ پہلی بار میں نے اسے کھودا تھا۔ ابن عباس کا کہنا ہے کہ بدو عرب کے بیان سے قرآن میں آئے ہوئے مذکورہ لفظ فطرت کے معنی کو سمجھا۔

نتیجہ نکلا کہ لغت میں لفظ فطرت بمعنی خلقت فقط انسان کے لئے استعمال ہوئی ہے۔

عربی زبان ومحاورہ میں۔ "فَطَر" کا ابتدا کے معنی میں استعمال موجود ہے۔ مثلاً کسی عرب کا قول۔

(1) فطر ناب البعیر اذا شق اللحم وطلع۔ اونٹ کے دانت جب پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں تو اس وقت اس لفظ کا برمحل استعمال ہے۔

(2) پہلی بار جب پستان سے دودھ نکلتا ہے تو اس وقت بھی اسے فطر کہتے ہیں۔ راغب اصفہانی نے بھی معنی اختیار بتائے۔

مرحوم شیخ عباس قمی نے اپنی کتاب سفینۃ البحار میں بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ شیخ عباس قمی نے ایک واقعہ بھی اس ضمن میں نقل کیا ہے۔

ابوبصیر کا کہنا ہے کہ وہ ایک دن حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں

موجود تھے کہ کھانا لایا گیا۔ جس میں اونٹ کا گوشت تھا ہم نے اسے کھایا پھر تھوڑا دودھ لایا گیا جسے امامؑ نے نوش فرمایا اور مجھ سے پینے کے لئے فرمایا چنانچہ میں نے پیا۔ پھر میں نے اس کے ذائقہ کو دیکھتے ہوئے امامؑ سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ تو امامؑ نے جواب دیا کہ یہ بالکل تازہ دودھ کا جھاگ ہے۔ (جو تازہ زائدہ جانور سے دوھا گیا ہے) یہاں بھی فطر بالکل ابتدائی منزل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ تین الفاظ ایسے ہیں جن کا ایک دوسرے سے فرق بیان کرنا ضروری ہے۔ وہ طبیعت۔ غریزہ۔ فطرت ہیں۔

## طبیعت

عام طور پر بے جان موجودات کے لئے لفظ طبیعت یا طبع استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: اگر ہم یہ چاہیں کہ کسی بے جان موجود کی خاصیت بیان کریں تو ہم اسے یوں کہیں گے کہ اس کی طبیعت یا اس کی طبع کا تقاضا یہ ہے۔ مثلاً کہیں گے کہ آکسیجن کی طبیعت کا تقاضا جلنا ہے۔ طبیعت کی لفظ عموماً بے جان چیزوں کے لئے بولی جاتی ہے۔

کبھی کبھی طبیعت کی لفظ پیڑ پودوں کے علاوہ جاندار کے لئے جیسے حیوان اور انسان کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ طبیعت کی لفظ جاندار کے لئے صرف ان جہات میں استعمال کرتے ہیں جو جاندار اور بے جان میں مشترک ہیں جیسے نشو ونما۔

## غریزہ

عام طور پر اس لفظ کا استعمال حیوانات کے لئے ہوتا ہے اور انسان کے

واسطے بہت کم جمادونباتات کیلئے تو بالکل نہیں بولا جاتا۔ حیوانات میں جو ایک قسم کی نیم شعوری کیفیت موجود ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنا چلنا پھرنا متعین کرتے ہیں۔ ان میں یہ کیفیت اکتسابی نہیں ہوتی بلکہ خالق کی طرف سے ان کی سرشت (خلقت) میں موجود ہوتی ہے۔ (اسے غریزہ کہتے ہیں) جیسے گھوڑی کا بچہ پیدا ہوتے ہی اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنا گرتا پڑتا اٹھ کھڑا ہونا۔ آخر کار چل کر اپنی ماں کے پاس دودھ پینے کیلئے پہنچ جانا۔ ماں کے سکھائے بغیر تھن ڈھونڈنا اور دودھ پینا شروع کر دیتا ہے۔ یا چیونٹی کا گیہوں کے دانے کو سوراخ میں لے جانا اور اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا کیونکہ اگر دانہ اپنی جگہ ثابت رہا تو کسی نہ کسی وقت اُگ سکتا ہے۔ اس کیفیت یا حالت کو قوتِ غریزہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جو ایک نیم شعوری حالت کا نام ہے۔ مگر فطرت کی لفظ کا استعمال ان کے لئے نہیں ہوتا۔

حیوانات میں ایک رجحان ہوتا ہے۔ رجحان ایک شعوری حالت کا نام ہے مگر اسے خود اپنے رجحان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اس سربستہ راز سے بالکل نابلد ہوتا ہے۔ صرف اس قدر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مبہم طور پر رجحان پایا جاتا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے فطرت کی لفظ انسان کے لئے مخصوص ہے۔ فطرت قوت غریزہ اور طبیعت کی طرح ایک تکوینی و قدرتی قوت ہے۔ جو سرشت انسان میں تو موجود ہوتی ہے مگر اکتسابی نہیں ہوتی۔ یہ قوت قوتِ غریزہ سے بالا اور زیادہ شعوری ہوتی ہے۔ انسان جہاں فطریات کا حامل ہے وہ یہ جانتا بھی ہے کہ وہ کیسی فطریات کا حامل ہے جبکہ اس کے برخلاف حیوانات قوتِ غریزہ رکھتے ہیں مگر ان کا علم نہیں رکھتے۔ دوسرا فرق فطرت اور غریزہ میں یہ ہے کہ غریزہ محدود مادی امور

سے متعلق ہوتا ہے مگر فطرت کا رابطہ اور تعلق ان مسائل سے ہوتا ہے جن کو ہم انسانی مسائل یا ماورا' حیوانات کے نام دیتے ہیں۔

فطریات کی دوسری قسم خواہشاتِ انسانی ہیں۔ آیا انسان خواہشات کے بارے میں کچھ فطریات رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کے تجزیہ و تحلیل کے لئے ہم انسانی خواہشات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(1) جسمانی خواہشات (2) روحانی خواہشات

حیوانات میں روحانی خواہشات نہیں ہوتیں۔ اگر ہوں بھی تو ان کو ان کا شعور نہیں ہوتا۔

## جسمانی خواہشات

جسمانی خواہشات سے مراد وہ خواہشات ہیں جن کا تعلق صرف جسم سے ہوتا ہے۔ جیسے بھوک لگنا۔ جو صرف جسم اور مادہ سے متعلق ہے۔ اس خواہش میں حیوان بھی انسان کے ساتھ شریک ہے۔ جیسے انسان کو بھوک لگتی ہے۔ اسی طرح حیوان کو بھی۔ یہ قوت عزیزہ سے مربوط ہے۔ یعنی اس کا تعلق انسان اور حیوان کے بدن کی بناوٹ و ساخت سے ہوتا ہے۔ جب بھوک کا احساس ختم ہو جاتا ہے تو دوبارہ اسے غذا کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ نیند جسمانی خواہشات میں سے ایک خواہش ہے۔ پیاس جسمانی..... ہے۔ جاگنا بھی جسمانی خواہش ہے۔

## جسمانی خواہشات کی اقسام

جنسی خواہشات۔ غیر جنسی (روحانی خواہشات) جنسی خواہشات۔ مثلاً

بیوی کی محبت۔ غیر جنسی خواہشات جیسے اولاد سے محبت یعنی انسان چاہتا ہے کہ وہ صاحب اولاد بنے اولاد سے لطف اٹھائے۔ جو لطف انسان اولاد سے اٹھاتا ہے وہ جسمانی لذات کے مشابہ نہیں ہوتی ہے۔ یعنی اس لطف کا تعلق کسی خاص عضو جسم سے نہیں ہوتا ہے۔

جنسی خواہشات میں کچھ حلال کچھ حرام ہیں۔ ان خواہشات کو اعتدال پر رکھنے کیلئے شریعت وضع ہوئی ہے اور اس شریعت کے نفاذ و حفاظت کے لئے نبی و امام بھیجے گئے ہیں تا کہ انسانوں کو اعتدال پر قائم رکھ کر منزل مقصود یعنی جنت تک پہنچائیں۔

## روحانی خواہشات

روحانی خواہشات کے 5 درجے یا اقسام ہیں۔

(1) حقیقت جوئی (2) اخلاق حسنہ

(3) حسن پسندی (4) خلاقیت

(5) عشق و پرستش

## 1- حقیقت جوئی

انسان میں ایسا ایک فطری رجحان موجود ہے وہ چاہتا ہے کہ حقائق کو جیسے کہ کماحقہ ہیں ادراک کرے۔

اس رجحان کا نام تلاشِ حقیقت' دانائی یا خارجی دنیا کی جستجو ہے مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک ایسا فطری رجحان ہے جس میں حقائق کے دریافت و ادراک کا شوق چھپا

ہوتا ہے۔ سرکارِ دو عالم کی ایک دعا ہے۔ اللھم ارنی الاشیاءَ کماھِیَ خدایا مجھے اشیاء کی حقیقت دکھلا چنانچہ بنیادی طور پر جس کو ہم فلسفہ اور حکمت کہتے ہیں اس کا مقصود معرفت حقیقت اشیاء ہی ہے۔

فلسفہ وحکمت بھی اشیاء کی حقیقت کی معرفت کا نام ہے۔ جیسا کہ بوعلی سینا فلسفہ کی غرض وغایت کے سلسلہ میں کہتے ہیں صیرورۃ الانسان عقلیاً شبیہ ھیأ ا تِعالَمِ العینی۔ فلسفی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فلسفی دنیائے عینی کے مانند تحمل کی دنیا بن جاتا ہے دنیا کا اس کی اصل حقیقت کے مطابق ادراک کرتا ہے اور سارے جہاں کی تصویر عقلی بن جاتا ہے۔

حقیقت جوئی کمالِ نظری ہے۔ یعنی انسان فطرۃً چاہتا ہے کہ کمالِ نظری پیدا کر کے حقیقت کو پالے۔ اس وجہ سے اس میں تلاش وجستجو کا رجحان باقی رہتا ہے۔ علم نفسیات میں اسے حس حقیقت جوئی یا حس کاوش کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقت جوئی بچہ میں تین سال کی عمر میں ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچہ متجسس ہو جاتا ہے اور اطراف کی چیزوں کے بارے میں پوچھتا ہے اور نادان والدین بچہ کے سوالات کو مہمل تصور کرتے ہیں ایسے والدین غلطی پر ہیں۔ بچہ کو سوال کا حق حاصل ہے۔ بالفرض بچہ کوئی ایسی بات پوچھتا ہے جس کا جواب ماں باپ کے پاس نہیں ہے تو ایسی صورت میں اسے جھڑکنا نامناسب ہے بلکہ درست یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو بچہ کو مناسب جواب سے مطمئن کیا جائے۔

یا اس طرح سے بہت سے کام کرتا ہے۔ مثلاً ہر چیز کو چھوتا ہے گراتا ہے توڑتا ہے اس موقع پر والدین یہ خیال کرتے ہیں کہ بچہ تخریبی ہے؟ کیا سچ مچ بچہ طبعاً برا اور

توڑ پھوڑ کرنے والا ہے؟ یا یہ ایک جستجو کا جذبہ ہے جو اسے ادھر ادھر کی چیزیں چھونے اور توڑنے پر مجبور کرتا ہے تا کہ پتہ لگائے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے ایسا کام ایک بڑا آدمی اس لئے نہیں کرتا کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے۔ مگر بچہ انجان ہونے کی وجہ سے جاننے کے لئے اسی کام کو کرتا ہے۔

ابوریحان البیرونی کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ اس کی موت کے وقت اس کا فقیہ ہمسایہ اس سے ملاقات کے لئے آیا ابوریحان نے فقیہ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ فقیہ نے تعجب سے دریافت کیا کہ یہ مسئلہ پوچھنے کا کونسا وقت ہے۔ تم تو بستر مرگ پر ہو؟ ابوریحان نے کہا کہ علم کے بغیر مروں یہ بہتر ہے یا بغیر جانے مر جاؤں یہ بہتر ہے۔ فقیہ نے مسئلہ بتایا اور اپنے گھر چلا گیا۔ ابھی وہ گھر میں داخل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ابوریحان البیرونی کا انتقال ہو گیا۔

کسی دانشور کا قول ہے کہ وہ کہتا ہے اگر مجھ سے کہا جائے کہ علم کے ہمراہ محتاج، فقیر، غریب، مسکین ہونا پسند کرو گے یا بغیر علم کے خوشحال اور دولتمند ہونا پسند کرو گے تو میں علم کے ساتھ فقر کو ترجیح دوں گا۔

## 2- اخلاق حسنہ

انسان میں جو دوسرا فطرۃً رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ اخلاق حسنہ کا رجحان ہوتا ہے۔ ہماری دنیا میں اسی رجحان کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے اگر اس رجحان میں مادی منفعت نظر آتی ہے۔ جیسے دولت سے دلچسپی وغیرہ۔ اس سے انسان مادی ضروریات پوری کرتا ہے۔ یہ منفعت ایک محسوس فائدے کا نام ہے اسے اخلاقیین کے نزدیک خیر

حسی کہتے ہیں۔

انسان فطرۃً ایسی چیزوں کا رجحان بھی رکھتا ہے جو اس کی حسی زندگی کے لئے منفعت کا باعث نہ ہوں بلکہ بزرگی وفضیلت کا سبب ہوں۔ جن کا تعلق عقل سے ہوتا ہے۔ ان کو خیر عقلانی کہتے ہیں۔

جیسے۔ سچائی کی طرف انسان کا جھکاؤ (رجحان) جھوٹ سے نفرت زہد وتقویٰ صداقت وپاکیزگی کا رجحان۔ یہ خیر عقلانی ہیں۔ پھر خیر عقلانی کی دو قسمیں ہیں۔

1- فردیٰ۔ 2- اجتماعی۔

## خیر عقلانی فردیٰ

جیسے۔ نظم وضبط کا پیدا کرنا۔ نفس امارہ پر قابو حاصل کرنا۔ اسی کو شجاعت کہتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں لڑنا دلیری کہلاتا ہے۔ نفس امارہ سے لڑنا شجاعت کہلاتا ہے۔

## خیر عقلانی اجتماعی

جیسے۔ دوسروں کی مدد کرنا۔ ایثار وقربانی کے جذبہ کے تحت دوسروں پر اپنی جان قربان کرنا۔ اپنی شدید ضرورت کے باوجود دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دینا۔ اسی کو سخاوت کہتے ہیں۔ ویطعمون الطعام علی حبہ الخ۔

## 3- حسن پسندی

انسان میں حسن کی طرف رجحان فطری ہے۔ خواہ یہ رجحان حسن پسندی کے لحاظ سے ہو یا حسن آفرینی کے لحاظ۔ کوئی انسان اس جذبے سے خالی وعاری نہیں

ہے۔ جیسے۔ ہر انسان کے لباس میں یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ دوسروں کو اچھا لگے یا کم سے کم برا نہ لگے۔ مناظر کا حسن۔ آواز کا حسن، خوش نویسی کا حسن۔ صفات و بلاغت کا حسن۔ فطرۃً پسندیدہ ہیں۔

## 4- خلاقیت (ابتکار و ابداع)

انسان میں یہ رجحان بھی فطری پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی ضرورت کی چیز اس کے پاس موجود نہیں ہے تو اس کو ایجاد کر لیتا ہے صنعت و ایجاد فطری ہیں۔ صناع کی بنائی ہوئی شے خواہ دوسروں کو اچھی نہ لگے مگر صناع اپنی ایجاد پر خوش ہوتا ہے۔ ایک صانع میں کئی رجحان ہوتے ہیں۔ مثلاً: شاعر بھی۔ انجیز بھی۔ عالم بھی۔

## 5- عشق و پرستش

انسان میں ایک رجحان موجود ہے جسے ہم عشق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جو محبت سے بالاتر ایک حقیقت ہے۔ محبت و عشق میں فرق یہ ہے کہ:

(1) محبت کا جذبہ ہر ایک میں پایا جاتا ہے۔ البتہ شخصیات کے اعتبار سے اس کی نوعیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ جیسے دو دوستوں کی محبت۔ مقصد و غرض کی محبت زن و شوہر کی محبت۔ بچوں و والدین کی محبت وغیرہ۔ اس کے تقابل میں عشق ہے جو ایک الگ حقیقت ہے۔

(2) ایک قلب میں محبت بہت سے اشخاص کی داخل ہو سکتی ہے لیکن عشق ایک ہی شخص (ذات) کا ہوتا ہے اور جب کسی دل میں عشق آجاتا ہے تو اس کی حالت کو متغیر کر دیتا ہے۔ ہر وقت بے قرار رہتا ہے۔ معشوق کے سوا اور کسی کا ذکر پسند نہیں

کرتا۔ رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ بدن سے فربہی معدوم ہو جاتی ہے۔

عشق دارد سہ نشاں اے باخبر آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر

اور معشوق سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی اس کی ایک آن پر جان و مال قربان کر دیتا ہے۔ اس کی مثال ہی کربلا ہے۔

## لفظ عشق

عربی ادب میں عشق کی لفظ عَشَقَ کے مادہ سے ماخوذ ہے اور خود عشق دیوار میں چپکنے والی ایک بیل کا نام ہے جو نمو کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہے اور دیوار کو اپنی جکڑ میں لے لیتی بڑھتی جاتی ہے۔

عاشق کے دل و دماغ میں عشق ایک ٹھوس وحدت پیدا کر دیتا ہے جو اسے تمام چیزوں سے لاپرواہ بنا دیتا ہے اور اسے ایک ہی جگہ پر لا کھڑا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی شخصیت کو فراموش کر کے پوری طرح معشوق میں کھو جاتا ہے۔

یہ کیفیت عشق جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ حیوانات میں وہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو انسانوں میں زن و شوہر کے تعلقات کا مظہر بنتا ہے۔ عشق خدا کا عطیہ ہے عشق کئی طرح کے ہوتے ہیں یا ایک طرح کا؟ بعض کا خیال ہے کہ عشق صرف ایک نوعیت کا ہوتا ہے اور وہ بھی جنس سے تعلق رکھتا ہے اور دنیا میں عشق کے نام پر جو کچھ بھی اپنی خصوصیات اور آثار کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ سب کا تعلق جنس ہی سے ہے۔

چند فلاسفہ جیسے بوعلی سینا، ملا صدرا، خواجہ نصیر الدین طوسی عشق کو دو نوعیتوں پر تقسیم کرتے ہیں۔

1- عشق جنسی۔(مجازی عشق) 2- عشق حقیقی۔

عشق مجازی۔ عشق حقیقی نہیں ہوتا۔ وقتی ہوتا ہے۔ دائمی نہیں ہوتا۔ اسے عشق جسمانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ عشق حقیقی دائمی ہوتا ہے۔ اس عشق کو عشق روحانی کہتے ہیں۔

## عشق مجازی (جنسی)

یہ عارضی و وقتی ہوتا ہے۔ یہ جذبہ معشوق سے وصال اور تشنگی بجھانے کے بعد ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور یہی اس کی انتہا ہوتی ہے۔

بخلاف عشق روحانی کے..... روحانی عشق ایک ایسی منزل پر پہنچتا ہے بقول محقق نصیرالدین الطوسی ایک ایسا عشق ہوتا ہے جو دو جان اور دو روح کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ انسان کا حقیقی معشوق ایک ماوراء طبعی حقیقت ہے جس سے انسان کی روح مل جاتی ہے اور اس کو پالیتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ حقیقی معشوق عاشق کے باطن میں ہوتا ہے۔ عاشق میں ایک زبردست عشق کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے عاشق اس کیفیت کو اپنی روح میں پنہاں کر لیتا ہے اور اس کے تصور سے خوش رہتا ہے اور اپنے تصور عشق کے علاوہ اور کچھ پسند نہیں کرتا۔

چنانچہ فلسفہ کی کتابوں میں مجنوں و لیلیٰ کی داستان ہے۔ مجنوں لیلیٰ کے عشق میں گرفتار ہے۔ بہر حال عشقیہ اشعار بھی کہے۔ شب و روز لیلیٰ ہی کے فراق میں تڑپتا رہتا ہے۔ ایک بار جب لیلیٰ اس کے پاس پہنچی اور مجنوں کہہ کر اسے پکارنے لگی تو آواز سن کر مجنوں لیلیٰ کی طرف متوجہ تو ہوا مگر اس نے کہا تم کون ہو؟ لیلیٰ نے کہا ارے تم مجھے نہیں جانتے میں تمہاری لیلیٰ ہوں تمہاری فکر میں آئی ہوں۔ لیلیٰ سوچتی ہی آئی کہ مجنوں

مجھے دیکھ کر بے چین ہو جائے گا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف دوڑے گا اور مجھے اپنی طرف کھینچ کے گھنٹوں باتیں کرے گا اور مجھے یہاں سے جانے نہیں دے گا مگر یہ سب کچھ نہ ہوا مجنوں نے کہا چلی جاؤ یہاں سے مجھے تمہارے عشق نے تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔

## عشق روحانی

روحانی عشق وہ ہے جو اپنے مبدا اور منتہی دونوں اعتبارات سے عشق جسمانی سے مختلف ہے۔

اس عشق میں انسان اپنے معشوق کے لئے سب کچھ قربان کر دیتا ہے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے اور ساتھ ہی اس پر فخر کرتا ہے۔ گویا معشوق کی راہ میں عاشق کا فنا ہو جانا ایک ایسی فضیلت ہے جو فائدہ اور نقصان کی نظر میں نہیں سما سکتا۔

صاحبانِ عرفان فرماتے ہیں کہ معرفت (عرفان) کا ماحصل محبت ہے اور محبت کا ماحصل مودّت ہے اور مودّت کی انتہا عشق ہے۔ عشق ہی منزلِ قلندر ہے عشق ہی راہ سالک ہے۔ مقصود عارف ہے۔ طریق فقراء ہے۔ معقل (نکیل) عشاق ہے اور محمل توحید ہے۔

پھر عرفاء فرماتے ہیں کہ عشق میں یہی ایک خوبی ہوتی ہے کہ وہ حسن کا وفادار ہوتا ہے یعنی عشق ہمیشہ حسن کے تابع ہوتا ہے۔ حسن ہوگا تو عشق ہوگا اگر حسن نہیں ہوگا تو عشق نہیں ہوگا۔ یہ عشق پیدا ہی حسن کی سرزمین پر ہوتا ہے اور کہیں بھی نہیں اُگ سکتا۔ بقول شاعر۔ حسن کیا ہے عشق کا حسن خیال۔

## محبت ومودت میں فرق

کیا قرآن کریم نے بلاوجہ لفظ محبت کو چھوڑ کر اجر رسالت مودت کو قرار دیا ہے؟ اس میں ایک راز تھا جس کو اس کے پردہ میں ظاہر کیا اور قیامت تک ہونے والے قیاسات واہیہ اور مقالات فاسدہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ آیئے؟ عرفاء سے پوچھ لیں کہ محبت کسے کہتے ہیں اور مودت کس چیز کا نام ہے۔ قرآن نے اس مقام پر محبت کو کیوں نہ ذکر کیا؟ اجر رسالت مودت کو کیوں قرار دیا؟ درانحالیکہ جہاں اللہ نے اس محبت کو اپنی جانب منسوب کیا وہاں اس محبت ہی کے لفظ کو استعمال کیا یحببکم اللہ۔ اللہ تم کو محبوب رکھے گا۔

لیکن جہاں ذوی القربی کا ذکر کر دیا اس محبت کا انتساب نہیں۔ اس میں کیا راز ہے۔

جواب یہ ہے کہ قرآن کی یہی ندرت ہے اور یہی اس کا اعجاز ہے۔ محبت اور چیز ہے مودت اور چیز ہے۔ محبت ہر اچھی اور بری اور ہر حسین وقبیح شی سے ہو سکتی ہے مگر مودت نہیں ہو سکتی۔

محبت عام ہے۔ اور مودت خاص ہے۔ مودت اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس کا ظاہر و باطن دونوں پاک و حسین ہو۔ اگر اس کا ظاہر باطن کے خلاف یا باطن ظاہر کے منافی یا ظاہر حسین اور باطن کریہہ (بدصورت) یا باطن حسین اور ظاہر قبیح۔ تو اس سے مودت نہیں ہو سکتی محبت ہو سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ نکلے کہ جن ذوات طاہرین کیلئے قرآن سوال مودت کر رہا ہے وہ ہر جہت سے حسین ہیں ان میں شائبہ قبح نہیں۔

اس کی تشریح اس آیت میں ہے۔

**انما یرد اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا۔**

اب پہچانئے کہ اس مرتبہ کے ذوی القربی کون ہیں۔

چونکہ ان ذوات کے متعلق عصمت کے بارے میں شبہ ہونے والا تھا اس لئے **الاالمودۃ فی القربی** کا سوال کر کے ہمیشہ کیلئے اس شبہ کو رفع کر دیا۔ اور چونکہ اپنی ذات کے بارے قبیح کا اشتباہ نہ ہونے والا تھا اس لئے اپنی جانب لفظ محبت کو منسوب کیا فرمایا یحببکم اللہ اور ان کے لئے لفظ مودت کو قرار دیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ محبت کا ماحصل مودت ہے اور مودت کا ماحصل عشق ہے۔ ایک کلیہ ہے کہ جب معشوق پر حسن عارض ہوتا ہے تو عاشق کو عشق لاحق ہو جاتا ہے اب یہ معشوق پر منحصر ہے کہ اسے کون سا حسن عارض ہوتا ہے؟ اسے جیسا بھی حسن عارض ہوگا عشاق پر ویسا ہی عشق لاحق ہو جائے گا۔ صاحبانِ عشق کہتے ہیں کہ عشق کا تعلق صرف حسن سے ہوتا ہے اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کا ادراک کر ہی نہیں سکتا جیسا کہ سماعت کا تعلق آواز سے ہوتا ہے اور وہ کسی دوسری چیز کو ادراک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔ اسی طرح عشق بھی حسن کے علاوہ کسی شی کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔

عشق کی آنکھ صرف حسن کے رنگ کو دیکھ سکتی ہے باقی سارے رنگوں کے معاملے وہ گویا نابینا ہوتی ہے یعنی بلائنڈ)

عشق حسن کی شعاع میں ایسا گم ہوتا ہے کہ اسے حسن کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ یعنی نہ خاندان۔ نہ ذات پات۔ نہ سیرت و کردار نہ عزت و دولت نہ تخت و تاج نہ تکلیف و اذیت نہ نام و نمود نہ نفع و نقصان۔

اسی لئے تو فرمایا گیا اَلمحب لَایُلامُ یعنی جو عاشق ہوتا ہے وہ قابلِ ملامت ہوتا ہی نہیں۔ عشق ہمیشہ حسن کا وفادار ہوتا ہے۔ عشق ہمیشہ حسن کے تابع ہوتا ہے لیکن حسن کبھی عشق کا وفادار نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن شہنشاہ ہے عشق جانثار غلام ہے حسن خدا ہوتا ہے تو عشق اس کا عبد۔ حسن صنم ہوتا ہے تو عشق اس کا پجاری ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی شہنشاہ اپنے غلام کا اور کوئی صنم اپنے پجاری کا کوئی خدا اپنے عبد کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ عبد اور غلام ہی اس کا پابند ہی ہوتا ہے۔

ہاں حسن اگر پابند ہوتا ہے تو وہ حسنات کا ہوتا ہے۔ یعنی جب عاشق میں کمال عشق کی وجہ سے حسنات پیدا ہو جائیں تو پھر معشوق اپنے عاشق کا عاشق ہو جاتا ہے عاشق اپنے معشوق کا معشوق ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں فرمایا کنت کنزاً مخفیاً فاحببت یعنی ان کی تخلیق کی وجہ عشق ہے۔ یعنی اس حسن ازل نے جسے بھی جامۂ وجود عطا فرمایا ہے اسے اپنے عشق کیلئے جامۂ وجود بخشا ہے۔ کیونکہ اس حسن ازل نے جس سے عشق کیا ہے اور اسے اپنے عشق کا مرکز قرار دیا ہے وہ لازماً حامل حسنات ہوگا۔

سرکارؐ وہ مرکز حسن ازل ہیں کہ جن کا حسن ازلی وابدی ہے اس لئے ان کے لئے جو عاشق حقیقی در کا تھا وہ بھی ازلی وابدی ہونا لازم تھا اور اللہ جل شانہ کے سوا کوئی ازلی وابدی ذات تھی نہیں تو لازم تھا کہ اِسی کو اس ازلی وابدی حسن سے عشق ہونا تھا اور وہ اپنے محبوب کو دل دے بیٹھا کیونکہ اس کے پاک محبوب صاحب حسنات تھے اور حسن ہمیشہ حسنات سے وفادار ہوتا ہے اس طرح سرکارؐ دو عالم اس حسن ازل کے عاشق قرار پائے مگر کمال حسنات اور ان کے ازلی ابدی حسن کی وجہ سے اللہ جل شانہ بھی اپنے حبیب پر عاشق ہوا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ میں بھی ازلی حسنات تھے جن کی وجہ سے وہ محسن قرار پایا اور سرکارؐ میں بھی ازلی حسنات تھے جس کی وجہ سے آپ بھی محسن عالمین قرار پائے لیکن ان حسنات کا مشاہدہ عام ناممکن تھا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان حسناتِ الٰہی اور حسناتِ حبیبؐ کی تجسیم کی جائے یعنی ان حسنات کو مجسم کر دیا جائے تا کہ ساری کائنات اپنی کھلی آنکھوں سے ان حسنات کا مشاہدہ کرے اور انہیں پتہ چلے کہ عشق جو حسنات کا وفادار ہوتا ہے تو آخر کیوں؟ بس اللہ نے فوراً اپنے حسنات کو تجسیم عطا فرمائی اور سامنے جو صورت آئی اس صورت مجسم کا نام رکھا۔ حسنؑ اور اس کے بعد سرور کونینؐ کے حسنات کی تجسیم ہوئی تو جو صورت سامنے آئی اس کا نام رکھا جناب حسینؑ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عشق کا تذکرہ نہیں فرمایا تو کیوں؟ جبکہ عشق کی اولین صورت مودت کا ذکر فرمایا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے احکام کی بنیاد یہ کہ **لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا**۔ یعنی انسان کو جو تکلیف شرعی دی گئی ہے۔ وہ بقدر وسعت ہوتی ہے یعنی انسان کی قوتِ برداشت سے باہر کسی چیز کا حکم نہیں دیا جاتا کیونکہ تکلیف مالایطاق عموماً جائز نہیں ہوتی اور عشق بقدر وسعت نہیں ہوتا بلکہ عشق بقدر قدرت ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے شرعاً عشق کا مکلف نہیں فرمایا۔

حقیقت ہے کہ عوائد کی تین اقسام ہیں۔

(1) عائد بقدر وسعت

(2) عائد بقدر ضرورت

(3) عائد بقدر قدرت یعنی جب کوئی فریضہ، حکم یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ یعنی کسی انسان کی مدد و نصرت کرنا۔

اس کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔

## پہلی حالت

پہلی حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان سے کوئی آدمی کہتا ہے میں ایک لاکھ روپے کا مقروض ہوں۔ قرض خواہ نے مجھے تنگ کیا ہوا ہے۔ میں استطاعت نہیں رکھتا آپ میری مدد کریں۔ آپ نے دس ہزار روپے دے دے۔ تو یہ مدد بقدر وسعت ہے۔ جبکہ اسے ضرورت ایک لاکھ کی ہے۔ آپ نے اپنی وسعت کے تحت مدد کی۔

## دوسری حالت

آپ کا عزیز کسی مقدمے میں ملوث ہو کر جیل میں ہے۔ اخراجات ایک لاکھ روپے کے ہیں آپ کے پاس فقط 10 ہزار روپے ہیں۔ باقی کی کوشش کرتے ہیں کہ رقم پوری حاصل ہو خواہ جائیداد وغیرہ فروخت کرنا پڑے۔ یہ عائد بقدر ضرورت ہے۔

## تیسری حالت

ایک بھوکا اور نابینا روٹی کا سوال کرتا ہے اور ایک کریم غلام سے کہتا ہے اسے روٹی دو۔ غلام کہتا ہے۔ روٹی اونٹ پر ہے۔ فرمایا اونٹ دے دو۔ غلام نے کہا اونٹ قطار میں ہے۔ فرمایا قطار دے دو۔ یہ عائد بقدر قدرت ہے۔

## عشق کی تکلیف

بقدر قدرت ہوتی ہے۔ یعنی عشق پر جتنا دباؤ ڈالا جائے۔ جتنی ازمائش کی جائے وہ عشق کیلئے تکلیف مالا یطاق کا درجہ نہیں رکھتا کیونکہ عشق میں کوئی بھی وزن برداشت سے زیادہ شمار ہوتا ہی نہیں ہے۔ جس کا مظاہرہ کربلا میں ہر طرح کی آزمائش سے ہوا اور امتحان دینے والا اپنے عشق میں کامیاب و کامران ہوا۔

اصول الکفر ثلاثة. الحرص والاستکبار. والحسد۔

ثقۃ الاسلام علامہ یعقوب الکلینی معناً ابو بصیر سے روایت کرتے ہیں۔ جناب جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کفر کی جڑیں تین ہیں۔ حرص، تکبیر، حسد جب کسی شخص میں ان کا بیج بویا گیا اور وہ اگنا شروع ہوا تو رفتہ رفتہ اگر توبہ و اصلاح سے کام نہ لیا گیا ایک درخت عظیم الشان ہو کر اس کے اتباع و اشیاع پر سایہ انداز ہوگا اور مدت تک پھل دے گا۔ جس میں ان امور ثلاثہ کی بنیاد رکھی گئی۔ رفتہ رفتہ وہ عمارت عالیشان بنے گی۔ پھر اس کا مہندم کرنا نہایت دشوار ہو جائے گا بعض اوقات یہ بنیاد ہزاروں برس تک باقی رہتی ہے۔

ان تینوں اصول میں سے امامؑ نے حرص کو مقدم کیا ہے اور اس سے اس کے کفر میں موثر ہونے کی کیفیت ثابت ہوتی ہے۔ بظاہر وجہ اس کی یہی ہے کہ شیطان پھندوں اور جالوں میں سے جن سے وہ بنی آدم کا شکار کرتا ہے۔ اول پھندا یہی ہے۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے فرماتے ہیں کہ ابن آدم کی مثال ریشم کے کیڑے کی طرح ہے جس قدر وہ اپنے اوپر اپنے تار لپیٹتا جاتا ہے اس قدر وہ اور گرفتار ہوتا

جاتا ہے اور نکلنے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اندر غم سے مر جاتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ اے انسان تیرا پیٹ سمندروں میں سے ایک سمندر ہے۔ اور وادیوں میں سے ایک وادی ہے اس کو سوائے خاک کے اور کوئی شے پر نہیں کر سکتی۔

## حرص و طمع میں فرق

حرص و طمع قریب قریب ایک ہی ہیں۔

فرق یہ ہے کہ:

حرص: حرص شدت شہوات دنیویہ ہے۔

طمع: دوسروں کے مال و دولت میں رغبت کرنا ہے۔ طمع نہیں پیدا ہوتی مگر حرص ہی سے۔

جب خود اپنی ضروریات شہوانی کو پورا نہ کر سکے گا تو دوسروں کے مال پر نظر کرے گا۔ امام باقر العلومؑ فرماتے ہیں کہ سب سے برا بندہ طامع ہے جس کو طمع کھینچے پھرتی ہے اور ذلیل کراتی ہے۔

صادقؑ آل محمدؐ فرماتے ہیں ورع انسان میں ایمان کو ثابت رکھتی ہے اور طمع اس کے ایمان کو خارج کرتی ہے۔

طمع کی ضد۔ استغناء بے نیازی بے پرواہی ہے۔

حرص کی ضد قناعت ہے۔

## تکبر

تکبر کی اصل عجب ہے۔ عجب رذائل قوتِ غضبیہ میں سے ہے۔

**عجب کی تعریف:** هو استعظام نفسه لاجل مایری لها من صفت کمال سواء کانت له تلک الصفة فی الواقع ام لا. ام کانت صفة کمال فی نفس الامر ام لا۔

یعنی کسی صفت کمال کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا خواہ وہ صفت فی الواقع موجود ہو یا محض خیال ہی ہو کہ مجھ میں یہ صفت (کمال) موجود ہے۔ اور خواہ وہ صفت نفس الامر حقیقت میں صفت کمال ہے یا یونہی اس کو کمال سمجھ لیا ہو۔ یہ عجب کہلاتا ہے۔ جب یہ صفت انسان کسی انسان میں راسخ ہوگئی اور اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنے لگ گیا تو رفتہ رفتہ دوسروں پر اپنے لئے فوقیت چاہتا ہے اور دوسرں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے اور ان سے بھی اپنی تعظیم کا طالب ہوتا ہے اور چاہتا ہے گو زبان سے نہ کہے۔ یہی صفت کبر ہے۔ جو نتیجہ عُجب ہے۔

حدیث: لایدخل الجنة من کان فی قلبه حبةً من خردل من کبر۔

یعنی جس کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہوگا تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

حدیث قدسی: الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی فی واحد منها القیه فی جهنم۔ کبریائی میری ردا ہے اور عظمت میری ازار ہے جو ان دونوں میں سے ایک میں مجھ سے تنازعہ کرے گا اور شریک ہونا چاہے گا اس کو جہنم میں

ڈال دوں گا۔

حدیث شریف: ثلث لا یکلمهم الله یوم القیامة. ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم. 1-شیخ زان2- مَلَک جبآر و مقل مختال۔

تین شخص ایسے ہیں کہ روز قیامت خدا ان سے بات نہیں کرے گا اور ان کی طرف نظر رحمت نہ ڈالے گا اور ان کا تزکیہ نہ کرے گا اور ان کے لئے دردانگیز عذاب ہے۔

1- ایک وہ شخص جو بوڑھا ہو کر زنا کرے۔

2- جو بادشاہ ہو کر جبر کرے۔

3- جو مفلس ہو کر تکبر کرے۔

## تکبر کے درجے:

تکبر کے تین درجے ہیں۔

1- عام بندگانِ خدا پر تکبر کرنا۔

2- خاصانِ خدا انبیاء و اولیاء اللہ سے تکبر کرنا۔ ان کی اطاعت و پیروی سے باز رہ کر دین و دنیا کو خراب کرنا۔ ان کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا۔

3- تکبر علی اللہ واستکبار عن عبادۃ اللہ ہے وھو افحش انواع الکبر واعظمها یہ سب سے برا سب سے بدتر تکبر ہے۔ ان لوگوں کی بازگشت جہنم ہے۔

لیکن بعض مقامات پر تکبر کرنا عبادت ہے۔

حدیث: التکبر مع المتکبر عبادۃ۔ متکبر کے ساتھ تکبر کرنا عبادت خدا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنے تکبر کو توڑتا ہے جس سے متکبر راہ الٰہی میں متنازع ہے۔

حدیث: کبر وامع المتکبرین۔ متکبرین کے ساتھ تم بھی تکبر کرو۔

## حسد

### حسد کی تعریف:

وھو تمنی زوال نعم اللہ عن اخیک المسلم مالہ فی صلاح۔ یعنی مسلمان بھائی کے لئے یہ خواہش کرنا کہ جو نعمت خدا اس کو حاصل ہے اور اس میں اس کی بہبودی بہتری ہے وہ اس سے سلب ہو جائے۔

اور اگر ایسی نعمت کا زوال چاہے جس میں اس کی بہبودی نہیں ہے۔ اسے غیرت کہتے ہیں نہ حسد اور اگر زوال نعمت نہ چاہے بلکہ خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت جو کسی مسلمان بھائی کو حاصل ہے اس کو بھی حاصل ہو جائے تو یہ غبطہ اور منافست ہے۔ یہ محمودہ پسندیدہ ہے۔

### حسد کی ضد:

مقابل۔ نصیحت و خیر خواہی ہے۔ وھو ان ترید لاخیک ما ترید لنفسک وتکرہ لاخیک ما تکرہ لنفسک۔

اپنے برادر مومن کے لئے بھی وہی چاہے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جو اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ برادر مومن کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

آنچہ برخود نمے پسندی بر دیگراں ہم پسند

**الحسد هو اشد الامراض واصبها واسواء الرزائل واخبثها۔**

حسد سخت ترین امراض نفسانیہ ہے اور بدترین وخبیث ترین رذائل خلقیہ ہے۔

**وبال الحسد يرجع الى نفسه ولا يُضرا لمحسودَ اصلاًo**

حسد کا وبال ونکال حاسد ہی کی طرف راجع ہوتا ہے محسور کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کی نیکیاں بڑھتی ہیں اور درجات بلند ہوتے ہیں۔

حدیث: **الحسد ياكل الحسناتِ كما تاكل النار الحطب۔**

حسد نیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

حدیث: **لا تتحاسدوا ولا تقاطعوا ولا تدابروا ولا تباغضوا وكونوا عباده الله اخوانا۔** آپس میں حسد نہ کرو۔ ایک دوسرے سے قطع رحمی نہ کرو۔ ایک دوسرے کا برا نہ چاہو۔ آپس میں بغض نہ رکھو اور خدا کے بندے ہو کر آپس میں بھائی بھائی بنے رہو۔

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں  اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

## اسباب حسد

علماء طب روحانی 7 تک معلوم کئے ہیں۔

1- خبث النفس

2- عداوت وبغض

3- حب ریاست وجاہ طلب

4- بعض مقاصد کے فوت ہوجانے کا خیال۔

5- تعزز (خودساختہ عزت) کی وجہ سے۔

6- تکبر

7- تعجب (عجب)۔

حضرت آدمؑ جب عالم وجود میں تشریف لائے تو ان کے پاس دائیں جانب تین حسین شکلیں نمودار ہوئیں۔ ایک سے آپ نے پوچھا تو کون ہے۔ جواب ملا۔ میں عقل ہوں۔ فرمایا سبحان اللہ کیا اچھی شکل پائی ہے۔ تیرا مقام کہاں ہے۔ عرض کیا دماغ میں۔ فرمایا آجا۔ دوسری سے دریافت کیا۔ تو کون ہے؟ کہا۔ حیا ہوں۔ کہا تیری جگہ کہاں ہے۔ کہا آنکھوں میں فرمایا سبحان اللہ۔ مبارک شکل ہے۔ فرمایا آجا۔ تیسری سے پوچھا تو کون ہے؟ کہاں رحم۔ فرمایا تیرا مقام۔ کہا دل میں۔ سبحان اللہ کیا ہی پاک صورت ہے۔ پھر بائیں جانب سے تین صورتیں قبیح شکل میں نظر آئیں۔ ایک سے پوچھا تو کون کہا۔ تکبر ہوں۔ تیرا مقام کہاں ہے کہا دماغ میں۔ فرمایا دماغ تو عقل کا مقام ہے کہا جب میں آتا ہوں تو وہ چلی جاتی ہے۔ دوسری سے پوچھا تو کون؟ کہا۔ میں طمع ہوں۔ تیرا مقام۔ کہا آنکھوں میں۔ فرمایا وہ مقام حیا ہے۔ کہا جس آنکھ میں طمع آجائے حیا نہیں رہا کرتی۔ تیسری سے پوچھا تو کون کہا میں حسد ہوں تیرا مقام۔ دل۔ فرمایا دل تو رحم کا مقام ہے۔ کہا جس دل میں حسد آجائے رحم جاتا رہتا ہے۔

معلوم ہوا تکبر کے ساتھ عقل۔ طمع کے ساتھ حیا۔ حسد کے ساتھ رحم جمع نہیں ہوسکتے۔

جس دماغ میں تکبر و تعلّی سما جائے عقل چلی جاتی ہے۔

جس آنکھ میں طمع جگہ پالے وہاں سے حیا رخصت ہو جاتی ہے۔ لادین له من لا حیاله جس دل میں حسد سما گیا اس میں رحم باقی نہیں رہتا۔

☆☆☆☆☆

# درس چہارم

## حصول علم کے ذرائع

حصول علم کے دو ذرائع۔

1- علم خارجی۔

2- علم باطنی۔

## علم خارجی یا ظاہری

قوت سامعہ۔قوت باصرہ۔ایک ذریعہ باطنی ہے۔جس کو عقل یا قوت عاقلہ یا قلب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔انہی تینوں کے مجموعی فعل سے علم حاصل ہوتا ہے۔اس مضمون کو خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ **الذی احسن کل شی خلقه و بدأ خلق الانسان من طین وجعل نسله من سلالة من ماء مهین ثم سواه ونفخ فیه من روحه وجعل لکم السمع والابصار والافئدة قلیلا ما تشکرونo**

اللہ پاک وہ ذات ہے جس نے ہر ایک چیز احسن اور نہایت عمدہ خلق کی ہے اور خلقت انسان کی ابتداء مٹی سے کی ہے اور اس کی نسل کو آب حقیر نطفہ سے پیدا کیا پھر اس انسان (انسان اول نہ اس کی نسل) کو درست و معتدل بنایا اور اس میں اپنی

روح پھونکی اور تمہارے واسطے کان۔ آنکھیں اور دل بنائے۔ مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: **واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیاء وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون**o خدا نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے واسطے کان، آنکھیں دل مقرر کئے (کہ ان سے علم حاصل کرو) کاش کہ تم خدا کی اس نعمت عظمیٰ کا شکر بجالاتے۔

ان آیاتِ مبارکہ سے صاف ظاہر ہے کہ تحصیل علوم کے ذرائع سمع۔ بصر۔ قلب ہیں اور علوم اکتسابیہ جو بطریق مروج حاصل کئے جاتے ہیں انہی ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ جب انسان کوئی بات استاد سے سنتا ہے یا کتاب سے دیکھ کر مضمون و معانی اخذ کرتا ہے تو اول اس کو حس مشترک لے لیتی ہے اور پھر حس مشترک اپنے خزانہ خیال کے سپرد کرتی ہے وہاں سے قوتِ واہمہ لے لیتی ہے اور وہ اپنے خزانے قوت حافظہ کے سپرد کرتی ہے پھر وہاں سے قوتِ عاقلہ لیتی ہے جس کو قلب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قوتِ عاقلہ کا کام یہ ہے کہ ان محسوسات و مدرکات کی تفصیل و تفریق کرے اور حکم لگائے کہ حق ہیں یا باطل۔ صحیح ہیں یا غلط۔ کلی ہیں یا جزئی۔ جنس ہیں یا نوع۔ وغیر ذالک۔ پس جو صحیح ہوتے ہیں۔ ان کو اختیار کرتی ہے اور جو غلط ہوتے ہیں ان کو ترک کرتی ہے۔ لیکن اس کا حکم لگانا اس پر موقوف ہے کہ وہ حواس جو اس کے جاسوس ہیں اس کو کچھ معلومات پہنچائیں۔ یعنی کوئی استاد تعلیم دے یا کتاب سے اخذ کریں۔

اگر اس کو یہ جاسوس خبریں نہ پہنچائیں تو یہ کچھ نہیں کر سکتی۔ گویا (عقل)

قوت عاقلہ (قلب) ایک معمار ہے جو بغیر اینٹ گارے وغیرہ کچھ نہیں بنا سکتا اب رہا یہ امر کہ آیا عقل ہمیشہ صحیح حکم لگاتی ہے کہ جس کو حق کہتی ہے وہ حق ہی ہو اور جس کو وہ باطل ٹھہرائے وہ باطل ہو۔

ہشام بن الحکم کا مناظرہ عمرو بن عبیدہ سے ہوا۔

ہشام نے (عمرو بن عبید سے) کہا تمہارے آنکھ ہے؟

عمرو.....اے لڑکے یہ کیسا مہمل سوال ہے۔

ہشام یہی پوچھنا ہے۔

عمرو.....پوچھو اگرچہ یہ احمقانہ سوال ہے۔

ہشام.....کیا تمہارے آنکھ ہے۔

عمرو.....کہا ہاں ہے۔

ہشام.....اس سے کیا دیکھتے ہو۔؟

عمرو.....رنگ اور صورتیں۔

ہشام.....کیا تمہارے ناک ہے؟

عمرو.....ہاں۔

ہشام.....اس سے کیا کرتے ہو۔

عمرو.....بُو بدبو سونگھتا ہوں۔

ہشام.....کیا تمہارے منہ ہے؟

عمرو.....ہاں۔

ہشام.....اس سے کیا کرتے ہو؟

عمرو.....چیزوں کا مزا پہچانتا ہوں۔

ہشام.....کیا تمہارے زبان ہے؟

عمرو.....ہاں۔

ہشام.....اس سے کیا کرتے ہو؟

عمرو.....کلام کرتا ہوں۔

ہشام.....کیا تمہارے کان ہیں؟

عمرو.....ہاں۔

ہشام.....اس سے کیا کرتے ہو؟

عمرو.....اس سے آوازیں سنتا ہوں۔

ہشام.....کیا تمہارے ہاتھ ہیں؟

عمرو.....ہاں۔

ہشام.....اس سے کیا کرتے ہو؟

عمرو.....اسے پکڑتا اور چھوتا ہوں۔

ہشام.....کیا تمہارے قلب (دل) ہے؟

عمرو.....ہاں۔

ہشام.....اس سے کیا کرتے ہو؟

عمرو.....اس سے جو کچھ ان اعضاء و جوارح پر وارد ہوتا ہے اور یہ محسوس کرتے ہیں۔اس میں تمیز کرتا ہوں۔

ہشام.....تو کیا یہ اعضاء و جوارح قلب (دل) سے مستغنی اور بے پرواہ

نہیں ہیں؟

عمرو.....نہیں۔ یہ اس کے محتاج ہیں۔

ہشام.....یہ کیونکر ہے حالانکہ وہ صحیح وسالم ہیں؟

عمرو.....اے لڑکے جب یہ اعضاء و جوارح اس میں شک کریں جو انہوں نے دیکھا۔ سونگھا۔ چکھا۔ سنا اور چھوا ہے تو اس کو قلب کی طرف رد کرتے ہیں اور اس کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ شک کو باطل کر دیتا ہے اور یقین کو کامل کر دیتا ہے۔

ہشام.....تو خدا نے قلب کو ان اعضاء و جوارح کا شک وشبہ دور کرنے کے لئے قائم کیا ہوا ہے؟

عمرو.....ہاں۔ ایسا ہی ہے۔

ہشام.....تو پھر قلب کا وجود ان اعضاء و جوارح انسانی کے لئے ضروری ہوا۔ ورنہ یہ تو قائم و مستقیم نہیں رہ سکتے۔

عمرو.....ہاں ایسا ہی ہے بغیر قلب یہ کچھ نہیں کر سکتے۔

ہشام.....اے ابو مروان (کنیت) خدا نے تیرے اعضاء و جوارح کو بغیر امام و پیشوا کے نہیں چھوڑا جو ان کے لئے صحیح کو صحیح حق کو حق کرتا ہے اور شک سے یقین دلاتا ہے اور اپنی اس مخلوق (نوع انسانی) کو اس حیرت و شک پر اختلاف میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے لئے کوئی امام اس نے خود مقرر نہیں کیا۔ جس کی طرف رجوع کریں تا کہ اپنے مشکوک وشبہات وحیرت واختلاف کو بغرض رفع اس کے سامنے پیش کریں۔

تیرے اعضاء کے لئے تو امام قائم کر دیا اور مخلوقات کو یونہی حیرت وشک و اختلاف میں بلا امام چھوڑ دیا؟

عمرو بن عبید یہ سن کر حیران ومبہوت وخاموش رہے اور دیر کے بعد بولا کیا تو ہشام ہے اور بعد تعارف گلے لگایا اور اپنی جگہ بٹھادیا۔

## علم باطنی

وجدان وتجربہ ومشاہدہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ہماری عقول ہمیشہ صحیح حکم نہیں لگاتیں اور اکثر غلطی کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم عقلاء کی غلطی اور ان کی عقلی تحقیقات کا حال سنتے اور پڑھتے ہیں کہ ہزاروں برس کی تحقیقات سے جو ثابت کیا بعد ازاں وہ جہل محض ثابت ہوا۔ جس کی ہزاروں مثالیں دنیا میں موجود ہیں اور عقلاء بھی وہ عقلاء جو اپنے مقام پر خدائے علوم سمجھتے جاتے تھے۔

بعض عقول کو تقلید کی ایسی عادی ہوتی ہیں کہ جو کچھ استاد کا قول یا کتاب کا مضمون ان کو ان کے جاسوسوں نے پہنچایا ہے۔ اس کی پیروی کرتی ہیں اور اس کو بے کم وکاست قبول کر لیتی ہیں اور خود کچھ تصرف نہیں کرتیں۔ پس یہ علم محض کتابوں کو رٹ لینے اور سنی سنائی باتوں کے یاد کر لینے کا نام ہے۔

اعتقادِ جازم مطابق واقع نہیں بلکہ اس کو علم تقلیدی کہتے ہیں۔ دراصل علم نہیں ظن کا فائدہ دیتا ہے۔

**قال المحققون لیس العلم یحصل بالسماع و قراۃ الکتاب والحفظ ذالک تقلید۔**

اس علم سے صرف دفع الوقتی ہوتی ہے علم واقعی کے نتائج اس پر مرتب نہیں ہوتے۔

بعض عقول ایسی ہیں جو ان مقدمات سے صحیح نتائج نکالتی ہیں اور بسا اوقات حق پر پہنچ جاتی ہیں۔ اگر ان کو اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے اور علائق تعصب وغیرہ عائق و مانع نہ ہوں کیونکہ عقل قوتِ روحانی ہے اور اپنے مبدأ عقل کلی و نفس کلی سے اس کو تعلق ہے اور وہ انسان کا باطنی معلم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاگرد استاد سے ایک مضمون سنتا ہے اور جب اس میں فکر کرتا ہے اور عقل سے کام لیتا ہے۔ تو استاد کی غلطی معلوم کر لیتا ہے۔ پس یہ علم جس سے اس نے استاد کی غلطی پکڑی ذرائع ظاہریہ سے حاصل نہیں ہوا کیونکہ ذرائع ظاہریہ (کان، آنکھ) سے یہ جو علم حاصل ہوا تھا وہ تو وہی مقدمات تھے جو استاد سے سنے تھے جو غلط ثابت ہوئے۔ لہٰذا یہ علم اس کا علم باطنی ہے اور عقل جس قدر تعلقاتِ جسمانیہ و عوائق مادیہ کی تاریکیوں سے دور تر ہو گی اور نفس مصفا و مجلی اسی قدر وہ عقل کل سے زیادہ قریب ہو گی اور اس کے موافق علوم حاصل کرے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حکم عقل کا صحیح و غلط ہونا موقوف ہے صحت مقدمات صفائی نفس اور اُس کو اپنی طبیعت پر آزاد چھوڑ دینے پر کہ کسی قسم کے لالچ، غلبہ، خوف، تعصب وغیرہ کی روک نہ ہو اور وہ آزادی سے حکم لگا سکے۔

الغرض اس کا حکم ہر صورت میں اور ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا کبھی صحیح اور کبھی غلط۔ خواہ کسی طرح پر اُس کو علم ہو۔ کسی طرح سے ادراک کرے۔ ظاہر ہو یا باطن اور اسی پر مشاہدہ و تجربہ شاہد ہے۔

پس جب ہمارے علوم اور ہماری عقل کا یہ حال ہے تو ان علوم پر نفس کو کبھی پورا پورا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر وقت ان میں غلطی کا امکان و احتمال موجود ہے اور

ہمارے یہ علوم ظنیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ بلکہ دراصل ظنیات ہیں۔ افادہ حق نہیں کرتے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ استاد جس سے یہ علوم جزئیہ حاصل کریں جن سے ہم جاہل ہیں وہ کیسا ہونا چاہئے؟ اور کیسے حاصل کریں۔ ہماری اس حالت میں تمام انسان مساوی ہیں۔ سب کا یہی حال ہے کیونکہ سب کے ذرائع علوم وطرق تحصیل ایک ہی ہیں اور نیز پیدائش میں سب یکساں ہیں۔

پس اگر ہمارا استاد بھی ہم ہی میں سے ایک ہو اور اسی خصلت سے متصف اور اسی مرض میں مبتلا اور اسی طرح کے علوم رکھتا ہو تو دو خرابیاں لازم آئی ہیں۔

1: اطمینان نفس حاصل نہ ہوگا۔ احتمال وامکان غلطی موجود رہے گا جو ان علوم کا خاصہ ہے۔

2: یہ کہ دور تسلسل محال لازم آئے گا۔ کیونکہ جب مثلاً زید کا استاد بھی اُس ہی جیسا ایک انسان ہے جس کے علوم موقوف ہیں قوتِ سامعہ اور قوتِ باصرہ پر۔ تو ضرور اس کو بھی استاد کی ضرورت ہے۔ پس اگر اس کا استاد زید کو فرض کیا جائے تو دور لازم آتا ہے اور تحصیل محال ہوتی ہے اور اگر کوئی تیسرا شخص فرض کریں تو پھر ہم اس کی نسبت دریافت کرینگے کہ اس کا علم کیسا ہے؟ اگر وہ بھی ایسا ہی ہے اور اکتسابی علم رکھتا ہے تو وہی دونوں خرابیاں موجود ہیں اور اسی طرح اس کو بھی ایک استاد کی ضرورت ہے اور اس طرح سے یہ سلسلہ غیر متناہی چلا جائے گا اور تسلسل محال لازم آئے گا۔

اور اگر بغرض محال تسلسل کو جائز سمجھ لیا جائے اور دنیا کو غیر متناہی مانا جائے تب بھی یہ خرابی موجود ہے۔ کہ ہم کو ان علوم سے کسی صورت میں اطمینان حاصل نہیں

ہوسکتا جو خرابی اول لازم آئی تھی وہی موجود ہے۔

جب تک یہ سلسلہ تعلیم ایک ایسے شخص ہر منتہی نہ ہو جو ہمارے اس سلسلے سے جدا ہو اور تحصیل علوم میں دوسرے شخص کا محتاج نہ ہو۔ بلکہ بالفطرۃ اس کی خلقت میں ودیعت کیا گیا ہو۔

اگر ایسا شخص نہ تسلیم کیا جائے تو ہمیشہ علوم میں مضطرب رہیں گے اور اطمینان کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

پس فطرت عالم دال ہے اور مشاہدہ شہادت دیتا ہے کہ اس عالم میں ایک معلم موجود ہونا چاہئے جو علم موہبتی فطری رکھتا ہو اور تمام کلیات و جزئیات امور کا جن کی اُس زمانے میں ضرورت ہو منجانب اللہ عالم ہو اور سچے اور یقینی علوم ہم کو تعلیم فرمائے اور ہمارے اور مبداء فیاض علیم ازلی کے درمیان واسطہ فیض ہو کہ اُس کے ذریعے سے علوم واقعی ہم کو پہنچیں اور نفس کو اطمینان حاصل ہو اور اُس کی تعلیم اور اُس کے بیان کردہ اصول معیارِ حق و باطل، صدق و کذب قرار پائیں اور اپنے اکتسابی اور تحصیلی معلومات و مدرکات کو ان اصول پر پیش کر کے حق و ناحق کی تمیز حاصل کریں۔ یعنی معلومات میں سے جو معلومات اس صاحب علوم موہبتی کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہوں۔ (افسوس اس زمانے کے اشخاص پر کہ اقوال انبیاء کو اپنے عقول کے مطابق کرتے ہیں اور ان اقوال کی تاویل) ان کو حق و صدق سمجھیں اور جو غیر مطابق ہوں ان کو کذب و باطل اور نفس کو یقین و اطمینان حاصل ہو۔

فان العلم مایتور به القلب وینشرح الصدر وتطمئن به النفس۔

پس یہ شخص جو دارائے علوم موہبتی ہو اور معلم واقعی اور خدا و بندوں کے

درمیان واسطہ فیض۔ اُسی کو لسان شرع میں نبیؑ رسولؑ (پیغمبرؑ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا بیان سابق سے بشہادت فطری اس عالم میں وجود نبی ضروری ثابت ہوا۔

صاحب عقل جو چشم بصیرت سے حقیقت عالم کو دیکھے وہ کبھی بھی وجود نبی کا انکار نہیں کرسکتا کہ دنیا میں ضرور ایک ایسا شخص ہونا چاہئے جس کے علم میں شک وشبہ کا احتمال نہ ہو اور اس کی تعلیم پر پورا بھروسہ ہو اور یہ نہیں ہوسکتا اگر وہی شخص جس کا علم فطرۃً اس کی خلقت میں ودیعت کیا گیا جو اور صرف خدا سے تعلیم پائی ہو اور ہماری طرح بطریق مروج علم تحصیل نہ کیا ہو۔ (جو یقیناً ناقص ہے اور ہرگز قابل اطمینان نہیں)

یہ تو بالبدایت ثابت ہے کہ ہم پر کچھ فرائض کی ادائیگی واجب ہے اور عقل اس امر پر شاہد ہے کہ جب تک علم یقینی کسی شے کا حاصل نہ ہو اس وقت تک ارتکاب فعل صحیح نہیں اس لئے کہ اگر ظنی طور پر ہم نے اس کو حق جان کر عمل کیا تو ہم یقینی طور پر اس فرض سے بری الذمہ نہیں ہوئے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ہمارا ظن غلط ہو اور مطابق واقع نہ ہو۔ کیونکہ احتمالِ خطا..... ہر وقت موجود ہے اور یہی حکم خداوندی ہے۔ لَا تَقْفُ ما لیس لک به علم۔ جس چیز کا تم کو علم یقینی حاصل نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو (مت کرو) ان الظن لایغنی من الحق شیئًا۔ ظن حق کا فائدہ نہیں دیتا۔

پس اگر ایک ایسے شخص کا وجود دنیا میں تسلیم نہ کریں جس کے ذریعے ہم کو علم یقینی حاصل ہو اور اس کے علم پر پورا پورا اعتماد ہو۔ ہم ان فرائض کی ادائیگی سے کبھی بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا ایسے شخص کا وجود عقلاً ضروری ہے اور ہم اسی کو نبی کہتے ہیں۔

یہی دلائل اس امر پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ دنیا میں پہلا شخص نبی پیدا کیا جائے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو بھی وہی خرابیاں لازم آئیں گی۔

اول: تو تحصیل علم کی کوئی صورت ہی نہ ہوگی اس لئے کہ سابق ثابت کر دیا گیا ہے کہ عقل انسان اپنے حکم کرنے میں تعلیم خارجی کی محتاج ہے جب تک اس کو خارج سے بذریعہ حواس مقدمات نہ پہنچیں یہ کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا کام انہی مقدمات پر حکم لگانا اور ان سے نتائج نکالنا ہے اور ابتداء خلقت میں کوئی خارج سے تعلیم دینے والا موجو نہیں۔ اس واسطے کہ یہ فرض کیا گیا ہے معلم ابتداء پیدا نہیں کیا گیا لہٰذا اس صورت میں انسان تحصیل علوم نہ کر سکے گا۔

دوسرے: یہ علوم تحصیلی واکتسابی اگر بفرض محال حاصل بھی ہو جائیں۔ مفید حق نہیں ہو سکتے احتمال غلطی موجود ہے جیسا کہ بیان ہوا پس ضروری ہوا کہ پہلا شخص نبی پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی وہ شخص جو علم فطری موہبتی رکھتا ہو۔

## اسلام

اسلام اس بات کو بالصراحتہ بیان کرتا ہے کہ اول انسان نبی ہی پیدا کیا گیا۔ یعنی ابوالبشر حضرت آدمؑ اور وہ معلم بتعلم الٰہی اور دارائے علم موہبتی تھے۔ ان جاعل فی الارض خلیفه وعلم ادم الاسماء کلها ثم عرضهم علی الحلائکة. ثم سواه ونفخ فیه من روحه۔ (سبحان الله طریق تعلیم بھی بتلا دیا۔ تعالی الله عما یصفون) لہٰذا جو لوگ اس کے قائل نہیں وہ اپنے مذہب کی حقیقت ثابت نہیں کر سکتے۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه۔

## ماحصل

ہر مطلق انسان حصول علم میں خارجی و باطنی ذرائع یعنی قوت سامعہ، قوت باصرہ، قوتِ عاقلہ ہی کا محتاج ہے۔ ان کے توسط سے علوم حاصل کرتا ہے۔ مگر جو انسان کامل (معصوم) ہے وہ ان ذرائع کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس انسان کامل کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ انی خالق بشرا من طین فاذا سوتیه ونفخت فیه من روحی فقعُوا له ساجدین o میں ایک صورت بشری مٹی سے بنانے والا ہوں پس جب میں اس کو بالکل درست کرلوں اور کامل کردوں اور اپنی برگزیدہ روح اس میں پھونک دوں تو اس کے لئے فوراً سجدہ میں جھک جاؤ۔ اس آیۃ مبارکہ میں "اذا سَویتُه۔" (جب میں اللہ تسویہ کرلوں) تک مطلق انسان کا ذکر ہے اور اس میں تمام انسان شریک ہیں اور یہ وہی "انشأناه خلقا اخر" کا درجہ ہے۔ اس میں روح عطا کر کے تمام قوائے ظاہریہ و باطنیہ سے انسان کو کامل بنا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک اور آیت میں اس کا ذکر ہے۔ یایها الانسان ماغرک بربک الکریم الذی خلقک فسواک فعدلک۔ اے انسان کسی چیز نے تجھ کو تیرے پروردگار کی نسبت مغرور بنا دیا ہے جس نے تجھے خلق کیا۔ پس درست و معتدل بنایا۔ بہر حال تسویہ و تعدیل مطلق انسانیت کی تکمیل ہے اور ونفخت فیه من روحی۔ یہ مقام خاص نبوت ہے اور یہ تکمیل صورت بشریٰ کے بعد کا درجہ ہے۔ جو عام انسانوں کو نصیب نہیں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ نقص و کمال باعتبار قوت و فعلیت کے ہوتا ہے جس میں کمالات بالفعل موجود ہوں وہ کامل اور جس میں بالقوۃ وہ ناقص۔ مثلاً تمام انسان

انسانیت میں مساوی ہیں اور تحصیل علوم و کمالات انسان کی قوت و استعداد ہر ایک انسان میں موجود ہے۔ لیکن ایک انسان نے بہت سے علوم عقلیہ ونقلیہ حاصل کر کے انسانیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور ایک شخص جاہل محض ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ لیکن استعداد وقوتِ تحصیلی موجود ہے۔ تو ایسی صورت میں وہی شخص افضل واشرف و کامل ہے جس میں اس وقت کمالات موجود ہیں۔ نہ وہ جس میں اُن کے حاصل کرنے کی قوت استعداد موجود ہے۔ اسی اصول پر تمام انواع واشخاص کا نقص وکمال مبنی ہے۔ مثلاً حیوان نباتات سے کامل ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ نفس نباتیہ میں بالقوہ موجود ہے وہ نفس حیوانی میں بالفعل ہے مع بعض امور بالقوۃ کے اسی طرح جو حیوان میں بالقوۃ ہوتا ہے وہ انسان میں بالفعل ہوتا ہے۔ اسی لئے جو کمالات نفس انسانیہ میں بالقوۃ ہوتے ہیں۔ وہ روح نبوتی کو بالفعل حاصل ہوتے ہیں۔ مع ان کمالاتِ خاصہ کے جو خاص ارواح قدس ہی کا حصہ ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ جو سب سے پہلے موضوع بیان پڑھی گئی ہے۔ یعنی ذرائع خارجیہ و باطنیہ مطلق انسان کے لئے ہیں) کان آنکھ دل سے علوم کا حصول عام انسانوں کے لئے ہے اور انسان اول وانسان کامل میں حصول علم کا ذریعہ روح خاص بنوتی قرار دی گئی ہے۔ جیسے فرمایا ونفخ فیه من روحی۔ اور ہر ایک نبی کو یہ روح عطا ہوتی ہے۔ لیکن یہ روح قدس بھی باعتبار شدت وتاکد وجود کے مختلف درجے رکھتی ہے۔ جیسا جس کا وجود ہے ویسی ہی روح ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بعض انبیاء بعض سے فوقیت وفضیلت رکھتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ومحقق ہے کہ ملائکہ کے کمالات بالفعل ہیں۔ ان کو جو کمال عطا کیا

گیا ہے وہ ابتداء خلقت سے عطا کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ ان میں قوت واستعداد ہوتی ہے اور پھر درجہ بدرجہ ترقی کر کے کمالات حاصل کرتے ہیں۔ **مامنا الا لہ مقام معلوم** ہر ایک فرشتے کو جو درجہ عطا کیا گیا ہے وہ ابتداء ہی سے عطا کیا گیا ہے اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے۔ ان پر ترقی نہیں کر سکتا۔

اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ایک کامل بالفعل دوسرے کامل بالفعل سے اشرف وافضل ہو سکتا ہے۔ روح قدس کے عطا ہوتے ہی آدمؑ کا مسجود ملائکہ ہونا (جن میں جبرائیل ومیکائیل وغیرہ جیسے مقرب فرشتے بھی داخل ہیں) اس امر کی بین دلیل ہے کہ روح قدس بنوتی کے کمالات فعلیہ ملائکہ کے کمالاتِ فعلیہ سے اشد، اقوی، اکدو اتم ہیں۔

ورنہ ہرگز مسجود ملائکہ نہ ہوتے۔ کیونکہ عالم بالفعل یعنی ملائکہ کو جاہل بالفعل حضرت آدمؑ کے لئے سجدہ کا حکم دینا قبیح ومذموم وتفضیل مفضول بر فاضل ہے اور خدا کی شان اس سے ارفع واعلیٰ ہے کہ اعلیٰ سے ادنی کی تعظیم کرائے۔ (ملائکہ عالم بالفعل ہوتے ہیں اور ان کے کمالات بھی کمالات بالفعل ہوتے ہیں)

لہٰذا معلوم ہوا کہ روح قدس نبوتی عالم بالفعل اور ملائکہ سے اشرف واکمل و افضل ہوتی ہے۔ ورنہ ملائکہ کی تعظیم سجودی کی مستحق نہ ہوتی اور چونکہ انبیاءؑ کی طینت طینت نورانیہ ہوتی ہے اس واسطے روح قدس کے عالم مواد واجسام میں داخل ہونے سے ان کے کمالات کی فعلیت میں نقص انحطاط پیدا نہیں ہو سکتا۔

انبیاءؑ کی طینت کا نورانی ہونا احادیث وآیات سے ثابت ہے۔ **قال ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی**۔ اے شیطان تجھ کو کس چیز نے منع کیا کہ تو

اس برگزیدہ شخص کو سجدہ کرے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اور ظاہرے کہ خدا اعضا و جوارح سے منزہ ومبرا ہے۔ اس کے ہاتھ ہیں نہ پیر۔ پس ان سے مراد مرحلہ روحانیت ومرتبہ طینت خاصہ نورانیہ ہے اور بسبب خصوصیت خاصہ اور قرب منزلت اس روح کو خدا نے اپنی ہی طرف منسوب کیا ہے اور مادہ نوراینہ کو بھی اپنی ہی ذات سے نسبت دی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ خاص و برگزیدہ روح ہے جو اور کسی کو عطا نہیں ہوئی اور یہ وہ نورانی مادہ ہے جو اور کسی کو نہیں دیا گیا۔ اس سے پیغمبرؐ کو خلق کیا گیا ہے۔

ایضاً حضرت عیسیٰؑ۔ وکلمة القاها الی مریم روح منه۔ یعنی یہ کلمہ وجود یہ الٰہیہ ہے اور اس کی برگزیدہ روح یہاں بھی مادہ جسمانیہ اور روح کو اللہ تعالیٰ نے اسی خصوصیت کی وجہ سے اپنی ہی طرف منسوب کیا ہے لہٰذا نص قرآنی ثابت کہ انبیاء کا مادہ عام انسانوں کے مادہ ظلمانیہ سے جدا ہے۔

پس جب کہ انبیاء علیہم السلام کا مادہ مادہ نورانیہ ہوتا ہے اور ان کی روح روح قدس ہے جو نفس علم ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جو کمالات وعلوم وملکات واستعداد وقوی اُس کے ماتحت انواع انسان وغیرہ میں ہوتی ہیں وہ سب بنیؑ میں ملکہ اور محض فعلیۃ کے درجے میں ہونگی اور وہ ہرگز عادی ومروج تعلیم کا محتاج نہ ہوگا۔ بلکہ تعلیم الٰہی کا محتاج ہو گا۔ خواہ بواسطہ ہو یا بلا واسطہ اور اس تعلیم الٰہی کا پہلا مرتبہ اسی روح نبوت کا عطا ہونا ہے۔ جو نفس علم وعین نور ہے۔

پس ثابت ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو فضیلت تمام ملائکہ پر حاصل ہوئی وہ بوجہ علم ہی تھی۔ جو عین کمال اور اصل فضیلت ہے اور اسی علم کے سبب خلیفہ فی الارض

ہوئے اور اسی سے معلم ملائکہ قرار پائے۔ حضرت آدمؑ کو تعلیم اسماء اس روح سے عطا ہوئی۔ علم ادم الاسماء۔ اس روح کے عطا ہوتے ہی ملائکہ کو سجدۂ تعظیمی کا حکم ہوا اور پھر ملائکہ کو تعلیم اسماء فرمائی۔

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ چونکہ حضرت آدمؑ اول انسان تھے۔ اس لئے بغرض اظہار قدرت وحق ومشرف وکرامت حضرت آدمؑ اُن سے یہ باتیں خلاف عادت بطور اعجاز ظاہر ہوئیں کیونکہ ایسی باتوں کا ظاہر ہونا کچھ خاص حضرت آدمؑ ہی سے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام انبیاء سے اسی قسم کے امور زمانہ حمل۔ وقت ولادت وعہد طفولیت میں ظاہر ہوئے ہیں۔

اس لئے کہ انبیاء سوائے خلق تقدیری یعنی صورت ظاہریہ' بشریہ' مادہ طینت انشاء ومولد میں دوسرے بنی نوع انسان سے ممیز وممتاز ہوتے ہیں۔

ملاحظہ ہو ولادت عیسیٰؑ۔ قال انی عبدالله اتانی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکا این ما کنت واوصانی بالصلوٰة والزکوة مادمت حیا. (سورمریم)

میں بندہ خدا ہوں اور مجھ کو خدا نے کتاب عطا کی ہے اور مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو ہر وقت ہر حالت میں مبارک بنایا ہے اور مجھ کو نماز وزکوٰۃ کی وصیت کی ہے۔

حضرت موسیٰؑ: اپنی والدہ سے تکلم کرنا اور ان کو تسلی دینا اور پیدا ہوتے ہی کلمہ توحید پڑھنا اور زمانہ حمل میں حمل کا ظاہر نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

جناب ابراہیمؑ: حضرت ابراہیمؑ کے حمل کا ظاہر نہ ہونا اور وضع حمل ہوتے ہی اشهد ان الا اله الا الله۔ کا پڑھنا اور اپنی والدہ کے سامنے فوراً دوڑنے لگنا اور اُن

کے خائف ہونے پر اُن کو تسلی دینا اور ستاروں کے اُفول وغیرہ سب سے توحید باری تعالیٰ پر استدلال کرنا۔ ایک روز میں اتنا بڑھنا جتنا اور بچے ایک ماہ میں بڑھتے ہیں۔

ایضاً سرکارِ دو عالم کے حالات ملاحظہ ہوں۔ جو عام انسانوں میں نہیں پائے جاتے۔ یہ اُسی روح القدس کے اثرات ہیں جس کے تمام کمالات بالفصل ہوتے ہیں اور محتاج تعلیم واکتساب نہیں ہوتے۔

احادیث وقرآن دال ہے کہ نبی کی نبوت روح قدس نبوتی سے ہے۔ نہ نفس ناطقہ انسانیہ سے۔ اس لئے فرمایا رفیع الدرجات ذوالعرش یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ لینذر یوم التلاق۔ (مومن)

یعنی وہ اللہ جو مراتب ودرجات کو بلند کرنے والا صاحب علم ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے ایک خاص روح اپنے مقام عالم امر سے عطا کرتا ہے۔ تاکہ وہ اُس روح امری کے ذریعہ لوگوں کو روز قیامت سے ڈرائے۔

☆☆☆☆☆

# درس پنجم

رَفِیْعُ الدَّرَجَات ذُوالْعَرْشِ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ o (پارہ نمبر 24 آیت نمبر 15 سورہ المومن)

اس آیۃ مبارکہ سے چند امور و مطالب ثابت ہوتے ہیں۔

**اول:** کہ درجات کا بلند کرنے والا خدا ہی ہے۔ وہ جس کو جو درجہ چاہے عطا کرتا ہے اور یہاں پر روح قدس (امری) کے ذکر سے پہلے اس کا بیان دلالت کرتا ہے کہ درجہ نبوت موہبتی ہے جس کو خدا مرحمت فرمائے نہ کہ جو شخص نیک کام کرے اور ریاضت کھینچے وہ نبی بن سکتا ہے۔ یہ عین انکار نبوت ہے۔

**دوم:** یہ کہ نبی کی نبوت روح قدس سے ہے اور وہ عالم امر سے ہے۔ نہ عالم خلق و مواد سے۔

**سوم:** یہ کہ اسی روح کے ذریعے نبی بشیر و نذیر پر ہوتا ہے اور یہی بار نبوت اٹھاتی ہے۔

**چہارم:** یہ کہ یہ روح اَمری خاص ہے ہر ایک کو عطا نہیں ہوتی۔ صرف پیغمبر بشیر و نذیر کو دی جاتی ہے۔ جیسے۔

ایدناہ بروح القدس. (بقرہ)

واذ ایدتک بروح القدس (مائدہ)

وایدھم بروح منہ (مجادلہ)

وکذالک اوحینا الیک روحامن امرنا. (شوری)

الغرض یہ تمام آیات قرآنیہ صراحتہ دال ہیں کہ نبی کی نبوت روح قدس نبوتی سے ہے اور وہ خاص انہی کو عطا ہوتی ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے پانچ روحیں دی ہیں۔ یعنی روح قدس، روح ایمان، روح قوت، روح شہوت، روح بدن، انہیں کی بنا پر فرمایا تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض۔ ان کو درجات عالیہ عطا فرما کہ روح قدس سے ان کی تائید کی۔

انبیاء کرام واوصیاء کو دیگر انسانوں سے ایک روح زیادہ عطا ہوتی ہے۔ جس کو روح القدس کہتے ہیں۔ روح القدس کے عطا ہوتے ہی چار کمالات صاحب روح کو حاصل ہو جاتے ہیں۔

1- یسمع کلام اللہ

2- یری ملائکۃ رایتہ

3- یعلم جمیع العلوم او اکثرھا من اللہ

4- وتطیعہ مادۃ الکائنات۔

**اول** : صاحب روح قدس۔ اللہ کا کلام سن لیتا ہے۔ ملائکہ کو دیکھ لیتا ہے تمام علوم یا جو (اس کی امت) کے لئے ضروری ہیں انہیں جان لیتا ہے اور کائنات کی ہر شے اس کی اتباع واطاعت کرتی ہے۔ روح القدس کے چند خواص ہیں۔ (1)

باعتبار شدت وتاکد روح قدس بعض انبیاء بعض سے افضل ہوتے ہیں۔

**دوم:** یہ کہ اس روح قدس سے مراد جبرئیل یا کوئی اور فرشتہ نہیں۔ بلکہ ایک خاص روح ہے اور جس طرح کہ دیگر ارواحِ وجود انبیاء ودیگر انسانوں میں ودیعت کی جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ روح بھی انبیاءؑ کو بوقت خلقت عطا کی جاتی ہے۔

**سوم:** یہ کہ روح قدس ہی مدرکِ علوم انبیاءؑ ہے اسی کے ذریعے تمام علوم حاصل کرتے ہیں اور فرش سے عرش تک کی باتیں جانتے ہیں۔

**چہارم:** یہ کہ روح قدس کے سوا باقی تمام ارواح کو موانع عارض ہوتے ہیں اور ان کو ان کے کام سے غافل کر دیتے ہیں اور روح القدس کا عمل کسی وقت بھی باطل نہیں ہوتا۔ دیگر ارواح میں حوادثِ زمانہ سے تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ تغیر پذیر نہیں۔

**پنجم:** یہ روح لہو ولعب اور امور دنیا کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔

**ششم:** جو اختصاص وتعلق خاص اس روح قدس کو اللہ تعالیٰ سے وہ اور ارواح کو نصیب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور اس وجہ سے قولِ معصوم (امامؑ) میں بھی یہ اختصاص موجود ہے جیسے فرمایا:

فعزه. فروح القدس من الله.

آیات مجیدہ میں۔ رُوْحٌ مِّنْهُ. وروحٌ مِّن اَمْرِنا۔ سے ماخوذ ہے۔

**ہفتم:** روح قدس کو سہو ونسیان عارض نہیں ہوتی۔ اس لئے نبی کے لئے سہو ونسیان وہزیان کا قائل ہونا سخت غلطی ہے۔

**ہشتم:** یہ کہ تمام ارواح کو نیند آتی ہے مگر یہ ہمیشہ بیدار ہے۔

قالؐ۔ تَنَامُ عَیْنِی وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ۔ میری آنکھ سوتی ہے مگر دل بیدار رہتا ہے۔ روح قدس نفس علم ہے۔ غفلت و ذہول و سہو و نسیان کو یہاں راہ نہیں۔ اس کا دامن علم و معرفت کبھی غبار جہل سے آلودہ نہیں ہوتا۔ کیوں نہ ہو روح قدس نبوتی بخصوصیت خاصہ حضرت حق جل شانہ کی طرف منسوب ہے۔ ضرور متصف باوصافِ خداوندی و متخلق باخلاقِ الٰہی ہونی چاہے تا کہ خلافت الٰہیہ کی مستحق ہو اور خلیفۃ اللہ کہلائے۔ کیونکہ خلیفہ مستخلف (جس کا خلیفہ و جانشین ہوتا ہے) کا آئینہ ہوتا ہے۔ چاہیے کہ اسی کی صفات سے متصف ہوتا کہ اس کی معرفت کا وسیلہ بن سکے۔ لہٰذا خلیفہ خدا مظہر تجلیاتِ ربانی ہونا چاہیے۔ وھو الحق۔ پس دلائل عقلیہ و آیاتِ قرانیہ و احادیث معادنِ علوم نبویہ سے ثابت ہوا کہ انبیاء میں فصل ممیز یہی روح قدس نبوتی ہوتی ہے جو دوسرے انسانوں میں نہیں پائی جاتی چونکہ یہ غیر محسوس و غیر مدرک تھی اس لئے اس کو لازم واثر خاص یعنی (وحی) سے تعبیر کیا گیا۔ یلقی الروح من امرہ۔

اب معلوم ہوا جس کو یہ روح امری دی جائے اس کا اول مخلوق و مصنوع ہونا ضروری ہوا اب تلاش کرتے ہیں کہ اول مخلوق کون ہوسکتا ہے۔ کیونکہ کسی سے تعارف حاصل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو خود ہم اس کو دیکھیں اور پہچانیں یا اور بتانے والا بتائے اور پہنچوائے۔ لیکن خود دیکھنا اس کو مقتضی ہے کہ پہلے سے ہمیں اس کا تعارف اس کے خدوخال سے واقفیت ہو ورنہ ہوسکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ اس کو دیکھ کر سمجھا ہے وہ واقعہ میں غلط ہو اور جس شے کا ہم تعارف حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ نہ ہو۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک بچہ کی ولادت کے وقت اس کا شفیق باپ

اس سے جدا ہو گیا اور سن شعور تک وہ اس سے جدا ہی رہا۔ اب وہ اس کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے باپ کا تعارف حاصل کرے۔ اب فرمایئے کہ وہ کیونکہ معلوم کر سکتا ہے؟ اولاً تو اس کا باپ لاپتہ ہے اس لئے اس سے ملاقات ہی دشوار ہے اور اگر تلاشِ بسیار کے بعد کہیں سراغ لگا بھی تو چونکہ اس نے کبھی باپ کو دیکھا ہی نہیں اور نہ صحیح صحیح اوصاف اس کو معلوم ہیں۔ اس لئے وہ کیونکہ اس کو پہچان سکے گا اور یقین کر سکے گا کہ یہ ہی میرا باپ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک اجنبی شخص ہو اور جو اوصاف وفضائل اس بچہ نے اپنے باپ کے لئے قرار دئے ہیں وہ اس میں ہوں اس لئے کہ وہ اوصاف جو واقع میں اس کے والد میں پائے جاتے ہیں ان کا تو اس کو علم ہی نہیں۔

ایسی صورت میں وہ اجنبی شخص اس کا باپ نہیں قرار پا سکتا بلکہ اگر اس کا حقیقی باپ اس سے یہ بھی کہے کہ میں تیرا باپ ہوں تب بھی عقلاً وثوق کا کوئی پہلو نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک غیر شخص ایسا کہہ دے اس لئے کسی سے تعارف حاصل کرنے کے لئے خود اپنا علم کافی نہیں۔ جبکہ ہمارے لئے یہ آیت بھی ہو۔ **وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً**۔ کیونکہ جو کچھ ہم سمجھیں گے وہ ہمارے ذہن کا خود ساختہ ہوگا نہ کہ اس شے کی حقیقت واقعیہ کا علم۔ اس لئے ہم کو ایک "مُعَرِّف" کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ ہم اشیاء عالم کو یقین کے ساتھ پہچان سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو اسماء مسیمات اللہ کو بتانے پڑے **علم ادم الاسماء کلھا**۔ ورنہ حضرت آدمؑ جو کچھ اپنے ذہن سے معلوم کرتے وہ انہی کے ذہن کا نتیجہ ہوتا۔ نہ اشیاء کی حقیقی معرفت۔

خصوصاً "مُعَرِّف" کی وہاں اور بھی ضرورت زیادہ ہے جہاں ایسی شے یا

ذات کا تعارف مقصود ہو جو دائرہ نظر سے باہر ہو۔ لا تدرک الابصار وھو یدرک الابصار۔ پس اس لئے تمام مخلوق خداوندی کو اپنے خالق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ایک مُعَرِّف کی ضرورت ہے۔

کیوں؟ اس لئے کہ وہ لن ترانی ہے۔ ہم نے نہ اس کو کبھی دیکھا ہے نہ دیکھ سکیں گے۔ اس لئے ہماری مثال بعینہٖ اس بچہ جیسی ہے جو اپنے باپ کی تلاش میں نکلا ہے۔ ہم کو اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ کوئی ہمارا خالق ہے اور بس جس طرح اس بچہ کو معلوم تھا کہ میرا کوئی باپ ہے اور بس۔

کیوں؟ اس لئے کہ وہ لطیف وخبیر ہے وھو اللطیف الخبیر اور ہم کثیف ہیں۔ ولقد خلقنا الانسان من سلالة من ماء مھین وھو الحکیم الخبیر وہ واجب الوجود قدیم بالذات ہے ہم ممکن حادث ہیں۔

کوئی رابطہ وعلاقہ نہیں۔ کل من علیھا فان وھو الحکیم العلیم و حکیم و خبیر و علیم بالذات ہمچیالت محض و کان الانسان ظلوماً جھولا وہ قدیر بالذات ہے ان اللہ علی کل شیء قدیر اور ہم محتاج محض ہمیں واسطہ وسیلہ کی ضرورت ہے۔ غرض ہمارے اور اس کے درمیان کوئی ایسا علاقہ ورابطہ نہیں جو ہم بلا معرف اس تک رسائی حاصل کر سکیں اور جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ پہنچوائے ہم نہیں پہچان سکے۔

کنت کنزا مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق۔

کیا واسطہ بین الخالق والمخلوق ہم ہی جیسا ہوگا؟ نہیں اگر وہ بھی ہم جیسا ہو گا تو خود واسطہ کا محتاج ہوگا۔ اس لئے اگر ہمارا خالق لطیف ہے تو وہ واسطہ نورانی ہو

گا اگر ہمارا خالق واجب الوجود بالذات اور قدیم وازلی وابدی بالذات ہے تو وہ قدیم بالغیر (یعنی جمیع مکتونات سے قبل وجود میں آیا ہوگا) اور حدوث ذاتی اس کی صفت خاص ہوگی۔

اگر ہمارا خالق علیم بالذات ہے تو وہ بھی حقیقت علم ہوگا اور حصول علم میں ظاہری آلات کا محتاج نہ ہوگا۔ اگر ہمارا خالق قدیر بالذات ہے تو اس کو بھی جمیع مکنونات ارضی وسماوی پر حق تصرف حاصل ہوگا۔ اگر ہمارا خالق عالم وما فیھا کو محیط ہے۔ وھو بکل شی محیط۔ تو وہ بھی نذیر وبشیر عالمین ہوگا۔

غرض وہ ہمارے خالق کے جمیع کمالات جمالیہ وجلالیہ کا مظہر تام ہوگا۔ خصوصاً علم میں تاکہ اس کو خالق کی صحیح صحیح معرفت حاصل ہو اور ہماری رہبری کرنے میں ہمارے خالق کا صحیح صحیح پتا دے اور جو کچھ وہ کہے وثوق سے کہے اس کو بھی اپنے کہنے پر وثوق ویقین ہو اور ہم کو اس کے کہنے پر۔ وہ ہمارے خالق کا ایسا نمونہ ہو کہ جب ہم اس کو دیکھیں تو یقین کے ساتھ اپنے خالق کی معرفت ہو جائے۔

یہ مسلم ومحقق ومبرہن ہے کہ ہر صاحب کمال اول اول جو شے بناتا ہے تو اس میں کمال صنعت کو کام میں لاتا ہے اور ہر طرح سے اس کو مکمل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ مصنوع کا کمال صانع کے کمال پر دلالت کرتا ہے اور اس کا نقص اس کے نقص پر۔ اس بات کا مشاہدہ ملکی نمائش میں اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ جہاں بڑے بڑے صناع اپنے کمال صنعت کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اس لئے ہمارے خالق کا مصنوع اول بھی جو عین کمال اور نفس کمال ہے ہر جہت سے مکمل اور اکمل ہوگا۔ اگر وہ علیم ہے تو اس کا مصنوع اول بھی حقیقت علم ہوگا۔

اگر قدیر ہے تو اس کے مصنوع اول میں بھی قدرت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہو گی۔ اگر وہ قدیم بالذات اور واجب بالذات ہے تو اس میں بھی قدامت و وجوب کی جھلک آرہی ہوگی۔ اگر وہ لطیف ہے تو اس کا مصنوع اول بھی نورانیت میں کامل ہوگا۔

غرض ہمارے خالق کا مصنوع اول جمیع صفات کمالیہ جلالیہ و جمالیہ کا آئینہ نام ہوگا۔ خصوصاً جبکہ وہ اس کو اپنا معرف قرار دے اور اسی لئے خلق کرے کہ اس کو دیکھ کر میں پہچانا جاؤں۔ کنت کنزا مخفیاً۔ الخ۔ تو اس مصنوع اول کے کمال کی کوئی حد ہی نہ ہوگی۔ نامعلوم اس قدیر و علیم و حکیم نے کیا کیا صنعتیں اس میں پنہاں کی ہونگی اور اپنے قلم ایجاد سے کیسے کیسے نقش ابھارے ہوں گے۔ واقعی اس احسن الخالقین کا یہ مصنوع اول دیکھنے کے قابل ہوگا اور مخلوقات کو بھی ایسے ہی معرف کی ضرورت ہے جو ہر طرح سے مکمل اور اوصاف خداوندی کا مظہر اتم ہو۔ اس لئے معرف خداوندی کو اول مخلوق ہونا چاہئے۔

پس ان دونوں تقریروں سے یہ نتیجہ نکلا کہ تمام مخلوقات ارضی و سماوی خود اپنے خالق کی معرفت سے عاجز ہے اور اس کا علم اس قابل نہیں ہے کہ وہ اس کے ذریعہ صحیح معرفت حاصل کر سکے۔ اس لئے اس کو ایک واسطہ مابین خالق و مخلوق کی ضرورت ہے جو اسی کا بھیجا ہوا ہو اور خالق کا صحیح پتہ دے اور اس کو اپنے قول و فعل پر وثوق ہو۔ وما ینطق عن الھوی ان ا ھو الا وحی یوحی۔

اور یہ بات نہیں ہو سکتی مگر مصنوع اول میں۔ وہ ہی ان جمیع اوصاف کا نمونہ کامل ہو سکتا ہے جس کی جمیع مخلوقات کو ضرورت ہے۔ وابتغوا الیہ الوسیلۃ۔

مصنوع اول کون ہے؟ عالم و ما فیھا جواہر و اعراض ہر منقسم ہے۔ جوہر۔

عرض سے افضل ہے کیونکہ عرض اپنی بقاء میں محتاج جوہر ہے۔ پھر جوہر کی دو قسمیں ہیں جوہر لاھوتی۔ جوہر ناسوتی۔

جوہر لاھوتی جوہر ناسوتی سے افضل ہے کیونکہ الطف اکشف سے افضل ہے۔ جوہر لاھوتی میں نفوس ملائکۃ اور نفس انسانی یا روح انسانی یا نفس ناطقہ داخل ہیں۔ ملائکہ نفس حیوانی سے افضل ہیں کیونکہ نور ظلمت سے افضل ہے۔ نفس انسانی ملائکۃ سے افضل ہے کیونکہ مختار مجبور سے افضل ہے۔ پس اول مخلوق اگر ہوسکتا ہے تو وہ انسان ہی ہوسکتا ہے۔

رہا حکماء متقدمین کا یہ خیال کہ اول مخلوق عقل ہے تو میں یہ تسلیم نہیں کرتا کیونکہ صانع عالم نے جس شے کی ایجاد پر فخر کیا ہے وہ یہی انسان ہے۔ تبارک اللہ احسن الخالقین۔ اس کی مدح ہے۔

پس اگر عقل سے مراد ملائکۃ ہیں تو وہ شرافت وفضیلت میں انسان سے کم ہیں اور اگر عقل سے مراد انسان کامل ہے تو فلا مناقشة فی الاصطلاح۔ ورنہ اگر کوئی تیسری شے ہو تو وہ قابل التفات نہیں ہے۔ رہے جنات تو وہ خود انسان کے ماتحت ہیں۔ جس نے ان کے وجود کو مع الدلیل بنایا ہے۔

اس نے ہم کو یہ بھی بتایا ہے کہ میں ان پر بھی نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پس بلاشبہ اول مخلوق انسان ہے۔ لیکن انسان ایک نہیں لاتعدُ لا تحصٰی ہیں۔ اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ انسانوں میں اول انسان کون ہے۔ ایک معیار کی ضرورت ہے اور بہترین معیار علم ہے۔ کیونکہ علم جمیع کمالات کو شامل ہے۔ قدرت بھی اسی کے ماتحت ہے۔

خلاق دو عالم نے بھی حضرت آدمؑ اور ملائکہ کے مقابلہ میں اسی علم کو معیار قرار دیا ہے۔ انبئونی باسماء ھولاء ان کنتم صادقین۔

ملائکہ نہ بتا سکے۔ حضرت آدمؑ نے بتا دیئے۔ اس لئے حضرت آدمؑ اس علم ہی کی وجہ سے بازی لے گئے۔ اس لئے ہم نے بھی اسی علم کو معیارِ اول مخلوق قرار دیا ہے۔

## انسان دو قسم کے ہیں۔

1- جاہل۔

2- عالم۔

علم جہل سے افضل ہے۔ ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون۔

## علم بھی دو قسم کا ہے۔

1- اکتسابی

2- وہبی

وہبی علم اکتسابی سے افضل ہے کیونکہ حقیقت مجاز سے افضل ہے۔ لہٰذا دائرہ مخلوق اول سے جاہل اور وہ عالم خارج ہو گئے جنہوں نے اکتساب علم کیا ہے یا ریاضت و محنت کر کے کوئی قوت یا ملکہ بہم پہنچایا ہے۔

اب رہے وہ نفوس قدسیہ جن کا علوم موہبتی ہے۔ تو آیئے اس گروہ میں دیکھیں کون اول مخلوق ہے؟

## کیا حضرت آدمؑ اول مخلوق ہیں؟

بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ اول بشر ہیں۔ لیکن جب استکبرت ام کنت من العالین o ہر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نفوس ایسے بھی ہیں جو حضرت آدمؑ سے قبل موجود ہیں۔ جن کی صفت ''عالین'' ہے اور جب علم آدم الاسماء کلھا۔ پر نظر پڑتی ہے تو یہ شبہ یقین سے بدل جاتا ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ تو صرف اسماء و مسمات ہی کا علم تھا اس لئے یہ اس معیار علم پر پورے نہیں اترتے جو شانِ اول مخلوق ہے۔

## کیا حضرت نوحؑ اول مخلوق ہیں؟

نہیں۔ یہ تو صرف ایک قوم پر مبعوث ہوئے تھے ان کا علم صرف اسی قدر تھا جو ایک قوم کو فائدہ پہنچا سکے۔ انا ارسلنا نوحا الی قومہ۔ اس پر شاہد ہے۔ اس لئے ان کا علم بھی وہ علم نہیں جو مخلوق اول کا ہونا چاہئے۔ خصوصاً جبکہ خود جناب نوحؑ کے کہنے سے کہ ما علمی بما کانوا یعلمون۔ سے بھی شبہ جاتا رہتا ہے۔

## کیا حضرت ابراہیمؑ اول مخلوق ہیں؟

بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کیونکہ جمیع ملکوت سموات وارض کا علم ان کو حاصل تھا۔ کذالک نری ابراھیم ملکوت السموت والارض لیکن جب نظر تحمق سے حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کو دیکھتے ہیں۔ رب ھب لی حکماً والحقنی بالصالحین اور ادھر۔ کلا اتیناہ حکما و علما۔ دکھائی دیتا ہے تو آپ بھی اعلیٰ معیار علم سے گر جاتے ہیں۔

## کیا حضرت موسیٰؑ اول مخلوق ہیں؟

نہیں کیونکہ یہ بھی اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ هل اتبعک علی ان تعلمان مما علمت رُشداً۔

## کیا حضرت داؤد وسلیمانؑ اول مخلوق ہیں؟

نہیں اگرچہ علمّہٗ مما یشاء صفت داؤدؑ کی ہے اور حضرت سلیمانؑ کی حکومت روئے زمین پر ہے۔ لیکن ولقد آتینا داؤد وسلیمان علما قالا الحمدلله الذی فضلّنا علی کثیر من عباده المومنین۔

ہر نظر پڑتی ہے تو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد وسلیمان کو صرف اس قدر علم دیا گیا تھا وہ اکثر مومنین سے فضیلت میں بڑھ گئے تھے اور نیز کلا اتیناه حکما و علماء کے ماتحت یہ دونوں بزرگوار بھی معیار علم پر پورے نہیں اترتے۔

## کیا حضرت عیسیٰؑ اول مخلوق ہیں؟

نہیں۔ آپ بھی اول مخلوق نہیں۔ کلمة الله القاها الی مریم۔ کیونکہ آپ بنی اسرائیل کے مصلح اور ہادی تھے۔ فرمایا یا نبی اسرائیل انی رسول الله الیکم۔ پس آپ کا علم بھی صرف اسی قدر تھا جو ایک قوم اور ایک گروہ کو مفید ہو سکے۔

## کیا محمد مصطفیٰؐ اول مخلوق ہیں؟

معلوم نہیں۔ معیار علم پر پرکھیے۔ اگر پورے اتریں تو مان لیجئے؟ لیکن ان کو اس معیار پر پرکھنے کے واسطے پہلے ان کی کتاب پر نظر ڈالیے کہ یہ کس حیثیت کی کتاب ہے۔ قرآن پاک کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایسی جامع اور اکمل ہے جو کہ

جملہ نوع انسانی کی ضروریات انفرادیہ ونوعیہ بلکہ جمیع عوالم کی ضروریات کو کلاً و جزاً حاوی نظر آتی ہے۔ کوئی ایسا حکم نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو۔ لارطب ولا یابس الافی کتاب مبین۔ یہ خشک وتر کا حکم اس پر موجود ہے اور کسی حیثیت سے اس میں کیا بنی انسان اور کیا بنی جان اور کیا حیوانات' سمرات وارضین ماوفیھا کا ایک کے لحاظ سے علم موجود ہے۔ فرطنا فی الکتاب من شی۔ دینی دنیاوی ہدایتوں کے واسطے تو سراسر نور ہے۔ قدجاء کم برھان من ربکم انزلنا الیکم نورا مبیناً غرض کوئی شے ایسی نہیں جس کا بیان اس میں موجود نہ ہو۔ تبیانا لکل شی۔ اس کی خاص صفت ہے۔ پس جب قرآن ایسی کتاب ہے جو کہ ہر حیثیت سے نوع انسانی کے جملہ احکام انفرادی واجتماعی کو حاوی ہے۔ دینی دنیاوی دونوں طریقوں کو واضح طور سے بیان کرتی ہے بلکہ جمیع مکنونات ارضی وسماوی کے احکام کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ ہر طرح سے اکمل وجامع ہے۔ اس ذات کے علم کا کیا کہنا جس کی طرف یہ کتاب منسوب ہو اور اس خزانہ علمیہ کا کیا کہنا جس میں ایسی مکمل کتاب ودیعت کی گئی ہو۔

انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لایمسہ الا المطھرون۔ کتاب مکنون جو کہ خزانہ علمی ہے آنحضرت کی ذات پاک ہے۔ لہٰذا اول مخلوق سرکار دو عالم ہی ٹھہرے اور پھر علمک لم تکن تعلم۔ اے رسولؐ جو کچھ بھی تھا ہم نے سب تجھ کو تعلیم کر دیا اب کوئی ایسی شے نہیں جو تجھ کو معلوم نہ ہو۔ کس وقت تعلیم دی جس وقت الرحمن علم القرآن۔ قرآن کی تعلیم دی۔ خاص صفت ہے۔ پس بلاشبہ آنحضرتؐ اس قرآن پاک کے اعتبار سے اسی درجہ علم پر فائز ہیں جو کہ معیار علم اول مخلوق ہے۔ پھر ذرا آنحضرتؐ کے اس دعویٰ پر نظر فرمائے کہ اول ماخلق اللہ

روحی. اول ما خلق لله نوری۔ اس میں شک نہیں کہ بعض وجوہات سے کبھی دعویٰ بھی خود اپنی دلیل ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ دیگر شواہد و قرائن بھی موجود ہوں اور دعویٰ کرنے والا صادق اور امین کے لقب سے ممتاز ہو ہر کہ ومہ کے قلب پر اس کی صداقت کا سکہ بیٹھا ہو۔ آنحضرتؐ کا یہ دعویٰ کرنا کب! جب کہ اس سے قبل کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کیسی حالت میں؟ جبکہ بات بات پر منکرین ومخالفین طالب ثبوت تھے۔ جناب کا ایسی حالت میں اس قدر زبردست دعویٰ کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کی حقیقت وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو روزمرہ جھوٹے دعوے کیا کرتے ہیں اور ان پر سوالِ دلیل کا دیو سوار ہوتا ہے۔ رسولؐ بلاخوف وخطر فرما دیتے ہیں۔ اول ما خلق الله نوری۔ ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ ایک دو کے سامنے نہیں مجمع عام ہیں۔ پس بلاشبہ آنحضرتؐ اپنے دعویٰ میں صادق ہیں۔ جس طرح دیگر دعاؤں میں صادق ہیں وما ینطق عن الھوی الا ھو الا وحی یوحیٰ۔ اس پر صداقت کی مہر ہے۔ اس لئے آنحضرتؐ بلحاظ دعویٰ بھی اول مخلوق ہیں۔

پھر ذرا اس پر بھی نظر ڈالیے آنحضرتؐ جمیع انبیاء ومرسلین کے بعد مبعوث ہوئے۔ یہ بات ہم کو بتاتی ہے کہ آپؐ جمیع انبیاء ماسلف سے علم میں افضل واکمل تھے کیونکہ آنحضرتؐ اسی بنا پر آخری درجہ کے معلم قرار پاتے ہیں اور مافوق اپنے ماتحت سے افضل ہوتا ہے۔

انبیاء کی بعثت پر جب نظر ڈالی جاتی ہے اور ان کی طولی وعرضی ترقی کو جانچا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک نبی اپنے پہلے نبی سے من وجہ افضل واکمل نظر آتا ہے۔ فضلنا بعضھم علی بعض۔ حضرت آدمؑ جس وقت نبی بنائے گئے اس

وقت چونکہ تمدن انسانی نے نشوونما نہ پائی تھی۔ اس لئے آپ کو صرف اسماء ومسمیات کا علم دیکر بھیجا گیا اور فطرت اولیہ کو قانونِ شرعی قرار دیا گیا۔ لیکن جب نوع انسانی نے ترقی پکڑی اور تمدن کی ضرورت ہوئی تو حضرت نوحؑ کو حضرت آدمؑ سے زیادہ علم دیکر بھیجا گیا اور ایک قانون شریعتی بھی۔ شرع لکم من الدین ما وصی به نوحاo جب نوع انسانی بہ نسبت زمانہ حضرت نوحؑ زیادہ ترقی یافتہ ہوگئی اور موجودات عالم پر غور وخوض بھی کرنے لگی تو حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ سے زیادہ علم دیکر بھیجا گیا اور بعض حقائق وبواطن علم بھی بتادئے گئے۔ تاکہ سیارہ پرستون وغیرہ کے عقائد یاطلہ کو واضح طور سے باطل کرسکیں۔ وکذالک نری ابراهیم ملکوت السموت والارض لیکون من الموقنین۔

جب اس سے بھی زیادہ نوع انسانی ترقی پکڑ گئی تو حضرت موسیٰؑ کو ایک قانونی کتاب تورات دیکر بھیجا گیا۔ وانزلنا التوراة فیها هدی ونور جب انسان اس سے زیادہ تمدنی ومعاشرتی حیثیت سے ماسبق انسانوں سے آگے بڑھ گیا تو حضرت عیسیٰؑ کو انجیل دیکر بھیجا گیا۔ واتیناه الانجیل o اب وہ زمانہ ہے کہ انسانی درجہ طفولیت سے گزر کر سن شعور کو پہنچ چکا ہے۔ اصول فطریہ کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی قابلیت واستعداد پیدا ہوچکی ہے۔ کیا دینی کیا دنیوی دونوں راہوں کو دیکھ چکا ہے۔ بس اس قدر دیر ہے کہ اب ایسا ریفارمر اور ہادی آئے جو فطرت کے مطابق تعلیم دے اور انسان کو اپنے ساتھ ان دونو راہوں پر چلادے۔ پس جب نوع انسانی اپنے مقصد کے قریب پہنچ گئے تو حضرت محمد مصطفیٰؐ فرقان دے کر بھیجے گئے۔ تبارک الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیراo تاکہ آپ اصول فطریہ کی

تعلیم دیں اسلام جو کہ عین فطرت ہے۔ ان الدین عنداللہ الاسلام۔ اس کے جملہ اصول اور احکام کو واضح طور سے سمجھا دیں یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے معمولی غور و تدبر سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

پس چونکہ آنحضرتؐ ترقی انسان کے آخری درجہ کے معلم ہیں یعنی معلم فطرت ہیں اس لئے آپؐ سب سے علم و فضل میں زیادہ ہیں اور ماسبق جس قدر انبیاء و مرسلین ہیں وہ سب آپؐ کے ماتحت ہیں۔ ورنہ انسان اپنے آخری درجہ ترقی (تعلیم فطرت) سے محروم رہتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے بھی آنحضرتؐ معیار علم پر پورے اترتے ہیں۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ سے قبل جس قدر انبیاء مبعوث ہوئے ان کی بعثت کی غرض صرف انسان میں فطرت کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کرنا تھی یعنی آخری تعلیم جو کہ تعلیم فطرت ہے اس کے سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت کا پیدا کرنا آنحضرتؐ سے قبل انبیاء کی بعثت کا مقصد تھا۔ جس طرح پرائمری اور ہائی سکولوں کے مدرسین اور ٹیچروں کی تعلیم کا مقصد بچوں کے اندر اس قدر استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ وہ کالج کی تعلیم جو کہ اصل ہے حاصل کر سکیں اور بس۔

بیان بالا سے چند باتیں مترشح ہوئی ہیں۔

**(اول)** آنحضرتؐ آخری معلم ہیں اور آپ کی تعلیم ماسبق انبیاء سے اعلیٰ و افضل ہے نہیں بلکہ مقصد انسانی ہے۔ اس لئے آنحضرتؐ کی تعلیم کے ہوتے ہوئے ماسبق معلمین کی تعلیم پر باقی رہنا گویا اپنی ترقی کے آخری درجہ پر پہنچنے سے روکنا ہے۔ تعلیم فطرت سے محروم رہنا ہے۔ مقصد انسانی سے الگ رہنا ہے۔

(دوم) چونکہ انسان کی آخری تعلیم تعلیم فطرت ہے اور اس کے بعد کوئی اور ایسا درجہ تعلیم باقی نہیں رہتا جس کی اس کو تعلیم کی ضرورت ہو۔ فاقم وجهک للدین حنیفا فطرة الله التی فطرالناس علیها لا تبدیل لخلق الله ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمونo اس لئے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ کے بعد نہ کس مرسل کی ضرورت ہے جو نئی شریعت لیکر آئے کیونکہ آنحضرتؐ آخری تعلیم تعلیم فطرت دے چکے اور اس کو مکمل بھی کر چکے۔ الیوم اکملتُ لکم دینکم۔ اس پر شاہد ہے (لہٰذا جو شخص آنحضرتؐ کے بعد نبوت کا مدعی ہو یا نئی شریعت کا مدعی ہو خدا کا بھیجا ہوا نہیں ہوگا۔ سچا نہیں ہوگا) اور اس کے بعد کوئی اور درجہ ترقی انسانی نہیں ہے اور نہ کسی نبی کی ضرورت ہے کیونکہ آنحضرتؐ کے بعد بعثت نبی غائت بعثت کے منافی ہے۔ اس لئے لاریب آنحضرت خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی (غیر صاحب شریعت) یا مرسل (صاحب شریعت) خدا کا بھیجا ہوا نہ آئے گا۔ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیینo لہٰذا آنحضرتؐ ہر اعتبار سے اول مخلوق ہیں اور جس قدر اوصاف ہم نے اول مخلوق ہونے میں تسلیم کئے ہیں وہ سب آپؐ میں موجود ہیں بلکہ ان سے بھی زائد۔

اگر ہمارا خالق علیم بالذات ہے۔ هو بکل شی علیم تو آنحضرت بھی حقیقت علم ہیں۔ لکن جعلناه نوراً حقیقتاً علم نور ہی ہے۔ العلم نور یقذفه الله فی قلب من یشاء۔

اگر ہمارا خالق قدیر بالذات ہے تو آنحضرت بھی عالم وما فیها پر ولی ہونے کی حیثیت سے حق تصرف رکھتے ہیں۔ اقتربت الساعة وانشق القمر۔

اس پر شاہد ہے۔

اگر ہمارا خالق قدیم ازلی و ابدی اور سرمدی ہے **ھوالاول ھوالاٰخر وانظاھر والباطن**۔ تو آنحضرتؐ میں بھی قدامت کی جھلک موجود ہے۔ **ونفخ فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض الامن شاء اللہ**۔ من شاء اللہ آنحضرتؐ ہی ہیں جو صعق وفزع سے بری ہیں۔

☆☆☆☆☆

# درس ششم

قال الامام جعفر صادقؑ. العلم ذاتهٗ ولا معلوم والسمع ذاته ولا مسموع والبصر ذاته ولا مبصر والقدرة ذاته ولا مقدور فلما احدث الاشياء وكان المعلوم.

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا علم اللہ کی ذات ہے وہ (معلوم) جانا ہوا نہیں۔

سمیع اس کی ذات ہے وہ سنا ہوا نہیں۔

بصر اس کی ذات ہے وہ دیکھا ہوا نہیں۔

قدرت اس کی ذات ہے وہ مقدور (قدرت دیا ہوا نہیں)

جب اس نے چیزوں کو پیدا کیا تو وہ معلوم بنیں۔ علم معلوم کا نام ہے اور نامعلوم سے مراد جہل ہے پس جو چیزوں کے پیدا ہونے سے معلوم یا علم پیدا ہوتا ہے وہ علم مخلوق ہے۔ صفات کی دو قسمیں ہیں۔

(1) صفات عین ذات۔

(2) صفات زائد بر ذات۔

ہماری صفات زائد بر ذات ہیں۔ بایں معنی کہ ذات و صفات عین ذات نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں یعنی اس کی ذات و صفات میں تفریق

نہیں ہے۔ کسی وقت بھی اسے علم وقدرت وسمع وبصر صفات سے عاری وخالی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ھو علم کلہ قدرۃ کلہ حیاۃ کلہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ کسبی، وھبی، تمام علوم کسبیہ ظنی ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ علوم حقیقہ واقعیہ نہیں ہو سکتے۔ علوم کسبیہ میں سہو ونسیان ہوسکتا ہے۔ علوم وھبیہ میں سہو ونسیان نہیں ہوسکتا۔

## پھر علوم حقیقیہ وھبیہ کی دو قسمیں ہیں۔

1- علم جزئی۔

2- علم کلی۔

## 1- علم جزئی وھبی

یہ عام ہے اور عام لوگوں کے لئے ہے۔ اس میں (وما اوتیم) من العلم۔ (جو علم میں سے تم کو دیا گیا ہے) فرمایا نہ ہے ما کسبتم۔ یعنی جو کچھ تم تحصیل وکسب کرتے ہو۔ جس سے ثابت ہے کہ اس علم سے وہ علم مراد ہے جو ہر شخص کو فطرۃً دیا گیا ہے اور ان کے وجود کے ساتھ عطا ہوا ہے۔ (جیسے مچھلی کے بچے کو تیرنا اس کی خلقت وجودی میں عطا کیا گیا ہے) چنانچہ ظاہر ہے کہ امور ضروریہ کو ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سچ اچھا ہے جھوٹ برا ہے اور دو اور دو مل کر چار ہوتے ہیں دس دو سے بڑا ہے۔ وغیرہ ذالک۔ جن کو مستقلات عقلیہ کہتے ہیں۔ اگر انسان کو فطرتاً کچھ علم عطا نہ ہوتا تو ہرگز قابل تکلیف نہ ہوتا کبھی مکلف نہ کہا جاتا۔ یہ امر شان خداوندی سے بعید ہے کہ انسان کو مکلف بنائے اور اس کو فی الجملہ علم عطا نہ فرمائے۔

علاوہ ازیں اگر انسان میں کچھ علم فطرۃً موجود نہ ہوتا تو خارج سے بھی اثر

قبول نہیں کر سکتا۔ پس اسی علم فطری کے ذریعہ سے معلم واستاد سے جو باتیں سنتا ہے ان کو سمجھتا اور قبول کرتا ہے اور اسی علم کے ذریعہ سے علم معلم سے اکتساب کرتا ہے۔ بہر حال اس علم سے مراد علم فطری ہے نہ کہ اکتسابی اور اسی کو علم کہا جاتا ہے جو عند اللہ علم ہے نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ علم جزئی ہے چنانچہ من سے جو جزئیت بالتبعیض پر دلالت کرتا ہے۔ ثابت ہے اور پھر لفظ قلیل سے اس کی تاکید مزید دلالت کرتی ہے کہ یہ علم علم جزئی ہے اور بہت ہی تھوڑا سا ہے۔ یعنی عام لوگوں کو جو علم فطرۃً عطا کیا گیا ہے وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔

انبیاء کرامؑ کو علم وھبی عطا ہوتا ہے۔ جس طرح نبوات (نبوت کی جمع) انبیاء سابقین تا حضرت عیسیٰؑ محدود ہیں اسی طرح علوم بھی ان کے بہ نسبت نبوت مطلقہ کلیہ جزئیہ اور محدود ہیں۔ لہٰذا جہاں کہیں ان انبیاء کے علوم کا ذکر قرآن میں آیا ہے ایسے ہی الفاظ میں آیا ہے جو جزئیت پر دال ہیں۔

چنانچہ انبیاء بنی اسرائیل کے حق میں فرماتا ہے۔ **ولقد اخترناھم علی علم علی العالمین۔** (سورہ دخان) ہم نے برگزیدہ کیا ہے ان (انبیاء) کو عالمین پر کچھ علم کے ساتھ اور سب انبیاء کی شان میں فرمایا **وکلاً اٰتینا حکماً وعلماً۔** (سورہ انبیاء) سب (انبیاء) کو ہم نے حکم اور کچھ علم عطا کیا ہے۔ **ولقد اتینا داود و سلیمان علما۔** (نحل) البتہ ہم داؤدؑ وسلیمانؑ کو ایک علم یا کچھ علم دیا۔ **اتیناہ حکما وعلما۔** (یوسف) ہم نے یوسفؑ کو کچھ علم عطا کیا۔ **ولوطا اتیناہ حکما و علما۔** (سورہ انبیاء) اور ہم نے جناب لوطؑ کو حکم اور کچھ علم دیا۔ غرض اس قسم کی اور بہت سی آیات انبیاء سابقینؑ کے متعلق ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا علم مثل ان

کی نبوات کے بہ نسبت نبوت مطلیہ کلیہ۔ محدود و جزئی تھا۔ جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہے کہ ان سب میں یہی مذکور ہے کہ کچھ علم دیا۔

## 2- علم کلی۔

جہاں علم کلی کا ذکر آیا وہاں (اولوا العلم) فرمایا ہے۔ یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات۔ (سورہ روم) وقال الذین اوتوا العلم والایمان۔ (سورہ مجادلہ) وغیر ذالک اور جس جگہ عوام کے علم جزئی کا ذکر ہے وہاں وما اوتیم من العلم الاقلیلا فرمایا۔ اول من تبعیضیہ لایا گیا ہے اور بعد ازاں لفظ قلیل یعنی جزو علم سے تھوڑا سا حصہ تم کو دیا گیا ہے۔ اور آخری مقام ختم نبوت میں فرمایا۔ علمک مالم تکن تعلم۔ (نساء) اے پیغمبرؐ! جو کچھ کہ تو نہ جانتا تھا سب خدا نے تعلیم کر دیا۔ کیا اسماء کیا مسمیات کیا حقائق و بواطن اور کیا ماہیات و ملکوت اشیاء۔ کیا ظاہر اور کیا باطن اور یہ مقام مقام نبوت مطلقہ کلیہ ہے۔ یہاں علم محدود جزئی نہیں ہے۔ ہم احصا نہیں کر سکتے کہ پیغمبر کو کیا کچھ دیا۔ دینے والا جانے یا جس کو دیا گیا۔ علم کی دو قسمیں۔ علم ذاتی بالذات اور علم ذاتی بالغیر۔ دو علم ہیں۔

**اوّل**: اول میں ذات نفس علم و عین علم ہے اور کوئی غیر اس کی علت نہیں ہے وہ علم خداوند عالم ہے کہ عین ذات ہے۔

**دوم**: دوسرے میں ذات و علم دو چیزیں ہیں۔ لیکن علم ذات کے ساتھ دیا گیا ہے اور اس کے لئے غیر از ذات واھب ومعطی (عطا کرنے والا) ضروری ہے اور یہ وہ علم ہے جو موجودات کو خالق عالم کی طرف سے حسب ضرورت و

موافق قابلیت واستعداد دیا جاتا ہے اور اس میں تمام انسان ونوع بشر شریک ہیں۔ لیکن عام جنس بشر کو بہت تھوڑا سا علم دیا جاتا ہے اور انبیاء کو ان تمام افراد بشر سے زیادہ جن پر وہ مبعوث ہوتے ہیں اور اسی طرح اس پیغمبرؐ ان..... کو جملہ موجودات ومخلوقات سے زیادہ جو تمام مخلوقات پر مبعوث ہوا اور وہ شکم مادر سے عالم بلکہ علیم پیدا ہوتے ہیں۔

ہاں بعض اسرار غیبت غیوب الٰہی اور ان کی تفاسیر وتفاصیل وقتاً فوقتاً ان کو پہنچتی رہی ہے۔

مزید تشریح۔ علم ذاتی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جہاں علم عین ذات ہے اور ذات عین علم۔ اسی کو علم ذاتی بالذات کہتے ہیں اور یہ مخصوص ہے ذات واجب الوجود سے کہ اس کی تمام صفات عین ذات ہیں نہ زائد برذات۔ پس اس کا علم بھی عین ذات ہے اور علم وذات دو چیزیں نہیں ہیں۔ اس کی ذات علم ہی علم ہے۔

## علم ذاتی

وہ علم ہے جہاں علم اور ذات دو چیزیں ہیں اور علم ذات سے علیحدہ اور زائد برذات ہے۔ گویا وہاں علاوہ علم اور شی بھی ہے صرف علم ہی علم نہیں ہے یہ ایسا علم ہے جو عین ذات نہیں ہے بلکہ خارج از ذات وزائد برذات ہے۔ محتاج معطی ومعلم ہے۔ خدا تعالیٰ نے ان کو یہ علم عطا کیا ہے۔ یہ علم ذاتی انبیاء کے لئے مخصوص ہے۔ اگرچہ زائد برذات ہے لیکن خدا نے ذات کے ساتھ عطا کیا ہے اور اس نبی کی ذات عین علم اور اس کا علم عین ذات نہیں ہے۔ بلکہ اس علم ذاتی کا ذریعہ روح قدس (روح نورانی علمی) ہے۔

## صفت ذاتی کی مزید تشریح

(1) صفت عین ذات وہ ہے کہ جو زائد بر ذات نہ ہو۔

(2) صفت ذاتی زائد بر ذات ہوتی ہے۔

(1) لیکن وجود میں ذات کے ساتھ ساتھ رہتی ہے کوئی وقت ایسا نہیں نکل سکتا جس میں ذات موجود ہو اور اُس میں یہ صفت موجود نہ ہو۔ یعنی صفت وجود سے ایک لمحہ کیلئے بھی علیحدہ وجدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جب سے وجود ہوتا ہے وجود کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

مثال۔ جیسے۔ احراق۔ (جلانا) یہ آگ کی صفت زاہد بر ذات ہے۔

جیسے۔ اشراق۔ (شعاع) شمس (سورج) کی صفت زائد بر ذات ہے۔ لیکن وجود میں اشراق (شعاع) شمس (سورج) سے جدا نہیں ہے۔ اسی طرح احراق (جلانا) نار (آگ) سے جدا نہیں ہے۔ یعنی ایسا کوئی وقت نہیں نکل سکتا جس میں سورج و آگ موجود ہوں اور ان میں اشراق و احراق نہ ہو۔ یعنی جلانا یا شعاع نہ ہو)۔

(2) صفت ذاتی وہ ہے جو ذاتِ شی (وجود) کو لازم ہو۔ یعنی موصوف اور صفت میں کسی اجنبی کا واسطہ نہ ہو۔ مثلاً پانی آگ پر رکھ کر گرم کیا جائے تو پانی یہ صفت حرارت جو آگ کے واسطے سے پانی میں آئی ہے تو حرارت پانی کی صفت ذاتی نہ ہوگی کیونکہ یہاں حرارت آگ کے واسطے سے پانی میں آئی ہے۔ آگ درمیان میں واسطہ نبی ہے حرارت کا۔ صفت ذاتی میں موصوف وصفت کے درمیان کسی اجنبی شی کا (غریت) واسطہ نہیں ہوتا۔ اللہ کی صفات عین ذات اس معنی سے ہیں کہ ذات اور

صفات میں کوئی تغایر نہیں ہے جو حقیقت ذات ہے وہی حقیقت صفات۔

پس اس بیان سے واضح ہو گیا کہ صفت زائد بر ذات کے لئے موصوف سے وجود میں جدا ہونا ضروری نہیں ہے۔ پس علم ذات پیغمبرؐ کی صفت زائدہ بر ذات ہے جو وجود میں ان ذوات مقدسہ سے جدا نہیں ہے۔ پس ایک مسئلہ تو یہاں حل ہو ہی گیا کہ ذاتِ پیغمبرؐ و آئمہ طاہرین میں علم ذاتی کا ماننا شرک فی الصفات نہیں ہے۔ شرک فی الصفات اس وقت لازم آتا کہ جب علم کو ان ذوات تمقدسہ کا عین سمجھ لیا جاتا اور ان ذوات کو قدیم مان لیا جاتا۔ ان کا وجود و علم دونوں خدا کا عطیہ ہیں۔ لہٰذا شرک نہیں ہے اور نہ شرک فی الصفات لازم آتا ہے۔ شرک فی الصفات اس وقت لازم آئے گا جب غیر اللہ کی صفات کو عین ذات سمجھ لیا جائے یعنی ذات و صفت کی حقیقت ایک تسلیم کر لی جائے۔ لہٰذا غیر اللہ کو اس کی صفات کے ساتھ ساتھ موجود ماننا شرک نہیں ہے دنیا میں ایسے بہت سے موصوف موجود ہیں جن کی صفات عین ذات نہیں ہے لیکن وجود میں یہ صفات موصوف سے منفک و منفصل (جدا) نہیں ہیں۔ جیسے (مچھلی کا بچہ۔ پانی میں پیدائش اور تیرنے کا علم) چہاردہ معصومینؑ بلکہ تمام انبیاء کرام کے متعلق عقیدہ ہے کہ ان حضراتؑ کے صفات کی حقیقت کچھ بھی ہو۔ لیکن ان کے صفات وجود میں ان کی ذوات مقدسہ سے منفصل و منفک (جدا) نہیں ہیں۔ جیسے قرآن میں فرمایا **ولقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنامعھم الکتاب** ہم نے رسولؑ بھیجے اور ہر ایک کو بینات اور کتاب وجودی) علم کے ساتھ نازل فرمایا۔ جس کی مثال جناب عیسیٰؑ ہیں۔ **انی عبداللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیا۔**

**اصل بحث: وکذالک اوحینا الیک روحامن امرنا ماکنت**

تدری ما الکتاب ولا الایمان. ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان۔
جیسا کہ بعض مفسرین وعلماء کرام نے اس آیت مجیدہ کی تفسیر میں اظہار فرمایا کہ کچھ لمحات یا وقت ایسا نکل سکتا ہے کہ سرکار موجود تھے اور علم بعد میں ملا۔ یعنی اول مخلوق بھی تھے اور (کتاب وایمان کے) علم سے بے خبر۔ یعنی معاذ اللہ (جاہل) پیدا ہوئے تھے پھر علم سے نوازا گیا۔ اول مخلوق ہوتے ہوئے علم وایمان سے بے خبر تھے۔

اس آیۃ مجیدہ پر۔ عقلی نقلی دلائل سے بحث کی جاتی ہے۔

باتفاق حکماء محققین وعلماء متکلمین یہ امر مسلم ومحقق ہے کہ خیر محض وخیر مطلق سے صدور شر قطعاً محال ہے۔ چنانچہ ان کا مشہور قول ہے۔ الخیر لایصدر عنہ الا الخیر۔ خیر سے خیر ہی صادر ہوتا ہے اور چونکہ صانع عالم خیر مطلق ہے اسی واسطے وہ قائل ہیں کہ وجود خیر ہے مطلقاً اور شر عدم۔ یعنی خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ خیر ہی پیدا کیا ہے۔ موجودات کی باعتبار حسن وقبح یہ شقیں ہو سکتی ہیں۔

1- تمام اشیاء خیر ہوں مطلقاً

2- تمام اشیا شر ہوں مطلقاً

3- بعض خیر ہوں۔ بعض شر۔

اور اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

1- خیر زیادہ شر کم۔

2- زیادہ شر خیر کم۔

3- یا دونوں برابر۔

سوائے شق اول سب صورتیں باطل ہیں۔ کیونکہ ہر صورت میں صانع و

خالق میں نقص لازم آتا ہے۔ کیونکہ نقص مصنوع دلیل ہے نقص صانع پر۔ اس وجہ سے ایک صانع جو کچھ بناتا ہے اس میں کمالِ صفت کو کام میں لاتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی نقص رہ جائے اور دیکھنے والے اس کو ناقص کہیں۔ پس صانع برحق و خالق مطلق جو کامل و اکمل و جامع جمیع صفاتِ کمالیہ ہے اس کی شان سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ نیز مبدأ فیاض میں بخل نہیں ہے جو مانع ہو عطاء خیر سے۔ پس صدور شر سے ذات واجب الوجود منزہ و مبرہ ہے۔

سبحان اللہ عما یصفون۔ جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے وہ خیر پیدا کیا ہے جو کچھ اس نے بنایا ہے نیک و حسن بنایا ہے۔ اس واسطے کہا گیا ہے کہ شرورات مجعول و مخلوق بالعرض ہیں۔ جیسے..... دھواں آگ سے..... سایہ دیوار سے

اللہ تعالیٰ کی مخلوق اول۔ مصنوع اول ذات سرکار آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ جیسے فرمایا اول ما خلق اللہ نوری۔

تو ان ذوات مقدسین علیہم السلام میں کسی قسم کا نقص یا کمی کا ہونا خلاق دو عالم کے (معاذ اللہ) ناقص ہونے کی دلیل ہوگا۔

## دلیل 2-

یہ مسلم مبرہن کہ ہر صاحب کمال اول شی جو بناتا ہے تو اس میں کمال صفت کو کام میں لاتا ہے اور ہر طرح سے اس کو مکمل بنانے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ مصنوع کا کمال صانع کے کمال پر دلالت کرتا ہے اور اس کا نقص اس کے نقص پر اس لئے ہمارے خالق کا مصنوع اول بھی جو کہ عین کمال و نفس کمال ہے ہر جہت سے مکمل و اکمل ہوگا خصوصاً علم میں۔ اگر خالق علیم ہے تو مصنوع اول بھی میں حقیقت علم ہوگا۔

اگر وہ قدیر ہے تو مصنوع اول قدرت کا کامل نمونہ ہوگا۔ مگر خالق قدیم بالذات ہے واجب بالذات ہے تو مصنوع اول میں بھی قدامت و وجود کی جھلک آرہی ہوگی۔ اگر صانع لطیف ہے تو اس کا مصنوع اول بھی نورانیت میں کامل ہوگا۔ ہاں اگر مصنوع اول میں کسی قسم کا نقص آگیا تو وہ دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اس میں دو قباحتیں ہو سکتی ہے یا تو صانع قادر نہیں تھا۔ یا قادر تو تھا مگر بخل سے کام لیا اس لئے مصنوع اول میں نقص آیا۔ یہ دونوں صورتیں قبیح ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے قدرت کی نفی نہیں ہوسکتی۔ عاجز خدا نہیں ہوسکتا کہ وہ علی کل شی قدیر ہے۔ ہر مصداقِ شی کے وہ قادر ہے۔ کیونکہ قدرت اس کی عین ذات ہے۔ لہٰذا وہاں کسی اعتبار سے سلب قدرت نہیں ہے۔

وہاں بخل بھی نہیں کیونکہ وہ کریم علی الاطلاق ہے۔ بخل بھی نقص ہے اور عجز بھی نقص ہے۔ واجب الوجود وہ ہے جس کی طرف کسی صفت نقص کی نسبت نہ دی جاسکے۔ لہٰذا مصنوع اول صانع کے علیم و قادر ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔

## دلیل 3-

مذہب امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک جیسا کہ شرط ہے کہ امام گناہوں سے معصوم ہو ویسا ہی شرط ہے کہ تمام عیوب سے بھی معصوم ہو۔ لہٰذا مصنوع اول میں یہ عیوب نہیں ہونے چاہئیں عیوب کی چار اقسام ہیں۔

1- عیب جسمانی۔
2- عیب نفسانی۔
3- عیب عقلی۔
4- عیب نسبی۔

## 1- عیوب جسمانی

واجب ہے کہ معصومؑ میں پیدائش تا عمر آخر۔ عیوب جسمانی جن کا تعلق جسم سے ہوتا ہے۔ نہ ہوں۔ مثلاً امراضِ مزمنہ۔ مستکرہ۔ منفرہ۔ یعنی وہ امراض جن کو دیکھ کر لوگ نفرت کریں یا ناپسند کریں۔ مثل۔ جذام۔ برص۔ وعمی (اندھا ہونا) وصمم۔ بہرہ ہونا وخرس۔ (گونگا ہونا) وغیرہ۔

یہ تمام عیوب جسمانی معصومؑ میں نہیں ہو سکتے۔

## 2- عیوب نفسانی

عیوب نفسانی وہ عیوب ہیں جن کا تعلق نفس سے ہوتا ہے۔

مثلاً: اخلاق ذمیمہ (مذموم اخلاق) معصوم بلند اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔ جیسے رسول پاکؐ کے لئے فرمایا انک لعلی خلق عظیم۔ مذموم اخلاق وہ ہیں عقلاً جن کی مذمت کی جا سکے۔

1- مثلاً بخل۔ (بخیل ہونا)

2- خست (کمینگی) کمینہ پن۔ غلظت۔ سخت وتند خو ہونا۔ (تندی مزاج عیب نفسانی ہے) فضاضت۔ وہ عیوب جن سے مصیبت وآفت واقع ہو مثلاً (دشمنی و حسد یہ تمام عیوب نفسانی ہیں۔ معصوم ان سے پاک ہوتا ہے۔

## 3- عیوب عقلی

یہ وہ عیوب ہیں جن کا تعلق عقل سے ہوتا ہے۔

مثلاً۔ جہل (جہالت) جنون (پاگل پن) امراض منسیہ وہ امراض جن سے

آدمی بھول و بہک سکتا ہے وہ تمام امراض معصوم میں نہیں ہوتے۔ جیسے خطا' سہو' ذہول۔نسیان' ہزیان' غفلت (عیب عقلی میں سب سے بڑا عیب جہالت ہے)۔

## 4-عیب نسبی:

یہ وہ عیوب ہیں جن کا تعلق خاندان سے ہوتا ہے۔یعنی ماں باپ کی طرف سے کسی قسم کا عیب شرعی نہ ہو۔

یعنی۔معصومؑ کے آباء واجداد ابتداء تا انتہا میں سے کوئی پست مرتبہ و کمینہ (معاذ اللہ) نہیں ہوتے۔امہات۔مائیں (ابتداء تا انتہا) طیبہ وطاہرہ ہوتی ہیں یعنی اخلاقی کمزوریوں و پیدائشی عیوب سے پاک وصاف ہوتے ہیں۔کیونکہ نسبی وخاندانی وجاہت کو قولِ اطاعت واتباع عمل میں بہت زیادہ دخل ہے۔نسبی وخاندانی وجاہت و شرافت رکھنے والا انسان پست وگرے ہوئے خاندان والے کی اطاعت واتباع قبول کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوسکتا۔اس لئے نبی وامامؑ کے لئے ضروری ہے کہ وہ شرافت نسبی ووجاہت خاندانی کے لحاظ سے بھی تمام امت سے بہتر ہو۔اس لئے نبی ہاشم شرافت نسبی میں خمس جو خدا ورسولؐ کا حق ہے اسی حق میں خدا ورسولؐ کے ساتھ شریک ہیں اور اسی لئے صدقہ ان پر حرام ہے۔جیسے اہلسنت کی فقہ کی کتاب قدوری مستحق زکوٰۃ کون ہے کون نہیں ہے۔کتاب قدروی باب من یجوز دفع الصدقة الیه ومن لا یجوز (ص 49 پر) لا یرفع الی نبی هاشم لقوله علیه السلام یا نبی هاشم ان الله حرم علیکم غسالة اموال الناس و اوساخهم وعوضکم عنها خمس الخمس۔

سرکارؐ نے فرمایا: اے نبی ہاشم اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے مال کے دھون اور ان

کے میل کچیل یعنی زکوۃ کو تم پر حرام قرار دیا ہے اور زکوۃ کے عوض تمہارا حصہ خمس میں رکھا ہے۔ یہی مضمون تفسیر بیضاوی نے اپنی بیضاوی تحریر کیا ہے۔ نیز سیرت حلبیہ حصہ دوم میں علامہ برہان الدین۔ مطبوعہ مصر میں مرقوم کیا ہے۔

لہٰذا سب سے بڑا عیب ان چار عیوب میں سے عیب عقلی ہے۔ (یعنی جہالت) کا عیب ہے۔ لہٰذا اول مخلوق کسی لمحہ میں بھی جاہل (علم سے بے خبر) نہیں ہو سکتا۔

## دلیل 4:

قاعدہ امکان اشرف..... قاعدہ امکان اشرف کے تحت یہ امر لازمی ہے کہ امام کا ہر زمانے میں موجود ہونا ضروری ہے۔ بلکہ قبل از زمانہ موجود ہونا واجب ہے۔ الحجۃ قبل الخلق ومع الخلق وبعدالخلق۔ یعنی حجت یا امامؑ کا وجود قبل الخلق ہوتا ہے اور مع الخلق ہوتا ہے اور بعد الخلق ہوتا ہے۔

### قاعدہ:

قاعدہ اس کا یہ ہے کہ واجب ہے کہ ممکن اشرف (اعلیٰ) مراتب وجود میں ممکن اخس (کم تر) سے اقدم (زیادہ مقدم) ہو۔ یعنی سلسلہ موجودات میں اشرف (اعلیٰ) موجودات سے مقدم تر ہو۔ یا یوں کہو کہ جب ممکنات کا سلسلہ موجود ہو تو واجب ہے کہ اشرف (اعلیٰ) ممکنات پہلے موجود ہو یا بعبارۃ اخری جبکہ ممکن اخس (کم تر) موجود ہو تو لابد (ضروری) ہے ممکن اشرف اس سے پہلے موجود ہو گیا ہو۔

محال ہے کہ واجب الوجود سے ممکن اشرف کا وجود متخلف ہو اور واجب ہے

کہ وہ ممکن اشرف دیگر ممکنات سے اقرب بواجب الوجود ہو اور واجب ہے کہ اشرف اور اخس کے درمیان مراتب مختلفہ ہوں اور وہ اشرف مالاشرف از مراتب علل و معلولات ہیں۔ من غیر ان یصدر عن الاخس الاشرف۔ ناممکن ہے کہ اخس سے اشرف صادر ہو۔ ناممکن ہے اس ترتیب پر کہ آخر مراتب تک اشرف سے اخس صادر ہوئے ہوں۔

قاعدہ ہے۔ اگر علت موجود ہو اور علت کے موجود ہونے اور اسکے معلول کے موجود ہونے کے درمیان کچھ وقفہ آجائے تو وہ علت اس معلول کی علت تامہ نہیں ہوتی۔ علت تامہ کے لئے لازم ہے کہ اس کے وجود کے ساتھ ہی اس کا معلول موجود ہو جائے۔

جیسے (اللہ تعالیٰ علت تامہ ہے اور محمدؐ و آل محمدؐ معلول اول ہیں اسی علت تامہ کے (پھر یہ محمدؐ و آل محمدؐ علت ثانیہ ہیں اور تمام عالمین ان کے معلول ہیں۔)

پس ایسی حالت میں علت کو معلول پر زمانہ میں تقدم نہیں ہوتا صرف تقدم ذاتی ہوتا ہے کہ اگر علت نہ ہوتی تو معلول نہ ہوتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ علت تامہ ہے۔ اسے تقدم ذاتی حاصل ہے۔ محمدؐ آل محمدؐ علیہم السلام معلول اول ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان تقدم زمانی نہیں ہے۔ تقدم زمانی کے یہ معنی ہیں کہ علت تامہ و معلول کے وجود کے درمیان زمانہ (وقت) کا تصور نہیں ہوتا۔ یعنی علت تامہ و معلول کے درمیان عدم (وقفہ) نہیں ہوتا۔

جناب علی علیہ السلام ایک خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں۔ توحید کے بارے میں۔ لا تصحبہ الاوقات۔ کوئی بھی زمانہ چاہے وہ ماضی ہو حال ہو مستقبل ہو خدا

کی معیت و مصاحبت میں نہیں ہے۔ ہم اکثر یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا ہمیشہ سے ہے۔ یہ صرف اس لئے کہتے ہیں کہ ہم خود زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں لہٰذا مجبوراً ہم یہ جملہ اپنی زبان پر جاری کرتے ہیں۔ ورنہ لفظ "ہمیشہ" کا اس مقام پر کوئی زمانی معنی نہیں ہے۔ یہاں لفظ ہمیشہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات میں فنا نہیں ہے۔

1- زمانہ۔ انسان اور جسم کا خاصہ ہے۔

2- زمانہ حرکت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ زمانہ کے پیدا ہونے کی علت حرکت ہے۔ حرکت عالم مادہ کا خاصہ ہے۔ اگر عالم مادہ سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے تو پھر زمانہ کا کوئی مفہوم نہیں رہ جاتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ زمانہ مقدار حرکت کا نام ہے اور حرکت مادہ کی خاصیت ہے لہٰذا عالم مجردات میں جو عالم مادہ سے بالاتر عالم ہے زمانہ کا کہیں سے گزر ہی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ جسم و جسمانیات سے پاک ہے۔ لہٰذا زمانہ عالم مادہ سے متعلق ہے۔ اس عالم مادہ سے جس میں حرکت پائی جاتی ہے اور خدا خالق زمانہ و مادہ و حرکت ہے اسی وجہ سے اس کی ذات اقدس میں زمانہ کا گزرنا ممکن ہے۔

مرحوم سید حبیب اللہ خوئی شرح نہج البلاغۃ کی گیارہویں جلد میں اس مناسبت سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل فرماتے ہیں۔ متن روایت یہ ہے۔ **روی فی البحار عن التوحید والا مالی عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ الصادق علیہ اسلام قال ان اللہ تبارک وتعالیٰ لا یوصف بزمانٍ و لامکانٍ ولا حرکۃٍ ولا انتقالٍ ولا سکونٍ بل ھو خالق الزمانِ والمکانِ والحرکۃِ والسکونِ والانتقال۔** ابوبصیر امام جعفر صادقؑ سے نقل

کرنے میں کہ آپ نے فرمایا خداوند عالم زمان و مکان و حرکت و سکون و انتقال سے متصف نہیں ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کا خالق ہے۔ پھر علیؑ نے فرمایا سَبَقَ الْاَوْقَاتَ کُوْنُہ۔ اس کا ہونا (وجود خدا) زمانوں سے پہلے ہے۔ خدا کا وجود ماضی، حال، مستقبل تمام زمانوں سے پہلے ہے۔ لیکن یہ سبقت (سبقت زمانی) نہیں ہے۔ بلکہ یہ سبقت (سبقت تکوینی ہے) اور علت و معلولی سبقت ہے۔

## سبقت زمانی:

جیسے کوئی کہے کہ ہمارے آباء و اجداد کو ہم پر یا ہمارے باپ دادا پر اور ہماری اولاد کو فلاں پر سبقت حاصل ہے یا فلاں کو اس کی اولاد اور اس کے پوتوں پر پوتوں پر سبقت حاصل ہے تو یہ سبقت زمانی ہے۔

## سبق الاوقات کونہ:

میں سبقت زمانی مراد نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کیلئے سبقت زمانی نہیں ہے بلکہ سبقت تکوینی ہے۔ یعنی وہ ذات ہے جو ہے لہٰذا زمانوں پر خدا کی سبقت، سبقت علی اور معلولی ہے۔ اس لئے کہ تمام زمانے مخلوق اور معلول خدا ہیں خدا کے یہاں دراصل کوئی زمانہ ہی نہیں جس کی وجہ سے سبقت زمانی ثابت ہو سکے۔

ہاں مخلوق اول۔ مصنوع اول۔ محمدؐ و آل محمدؐ یہ معلول اول ہیں اور اللہ تعالیٰ علت تامہ ہے۔ ان کے وجود اور ذات خدا کے درمیان سبقت زمانی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ذوات اللہ کے نور کا ظل، اثر، پرتو سایہ ہیں۔ پرتو وجود سے سبقت زمانی نہیں رکھتا۔ جیسے آگ جلاتی ہے۔ آگ وجود ہے۔ حرارت آگ کا پرتو۔ ظل اثر آگ

حرارت پر سبقت رکھتی ہے لیکن سبقت زمانی نہیں ہے بلکہ سبقت علی و معلول ہے۔ اس لئے کہ حرارت آگ کا معلول ہے۔

سبقت زمانی یعنی کوئی وقت ایسا نہیں نکل سکتا کہ آگ ہو اور حرارت کچھ دیر کے بعد ہو یا سورج ہو اور شعاع کچھ وقفہ کے بعد ہو۔ بلکہ جب سے سورج تب سے شعاع ہے۔ محمد آل محمد نور خدا کے پرتو و ظل ہیں۔ ان کے ہونے اور اللہ کے درمیان میں وقت نہیں ہے۔ سبقت زمانی نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ علت تامہ ہے۔ علت تامہ کے موجود ہونے پر معلول کا تخلف علی المراد محال ہے۔

## دلیل نمبر 5-

الحجة قبل الخق ومع الخلق وبعد الخلق۔ امام الخلق کے تین کون اور وجود ہیں۔ کون قبل الطبیعه دوسرا کون مابعدالطبیعة تیسرا کون عندالطبیعه۔

## وجود امام تین قسم پر ہے۔

(1) وجود قبل الخلق۔

(2) وجو بعد الخلق۔

(3) وجود مع الخلق۔

1- کون قبل الطبیعة جبکہ وہ (امامؑ) خزائن علم الٰہی میں موجود ہوتا ہے۔

2- کن عندالطبیعة جبکہ وہ (امامؑ) مدبر بدن ہوتا ہے اور نفس کہلاتا ہے۔

3- کون مابعدالطبیعة جبکہ بعد استکمال بدن انسان کو چھوڑ جاتا ہے اور

اس کے جملہ کمالات بالفعل ہو جاتے ہیں۔ اس کون سے اسے روح کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ کمالِ اشیاء کمالِ باطنی پر ہے نہ صورت ظاہری جسمانی پر۔ پس اب ضروری ہے کہ حجج اللہ کی روح دیگر ارواح سے کہیں اشرف واقوی واکمل ہو اور کمال وہ ہے جس سے ذاتِ کامل متصف ہو سکے اور کامل صرف ذاتِ واجب الوجود ہے پس کمال ہر ایک ممکن کا یہ ہے کہ وہ متصف باوصافِ خداوندی ہو اور یہ اتصاف بالکمالات اور اتصال موقوف ہے تجرد پر۔ پس مقرب ترین موجودات مجرد ترین مصنوعات ہیں اس لئے مقربین خصوصاً مقربین سابقین کی ارواح کا عام ارواح سے مجرد تر اور اکمل واقویٰ واشرف وافضل واعلیٰ اور ان سب سے فوق وبالا ہونا ضروری و لازمی ہے۔ اس لئے فرمایا۔ رفیع الدرجات ذوالعرش یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عباد لینذر یوم التلاق۔

عالم امر فوق عالم خلق ہے۔ الا لہ الخلق والامر۔

یہ روح (امری) جو مابھا النذارت ہے عالم اَمر سے ہے نہ عالم خلق سے اور اس کا تعلق بس عرشِ الٰہی ہے اور عرشِ الٰہی علم الٰہی ہے۔ پس لابد ثابت ہوا کہ بعض نفوس بعض سے ازکی اور بعض ارواح بعض سے مجرد تر ہیں اور بعض فوقِ بعض ہیں اور اس لئے ضروری ہوا کہ جو وجود مجرد تر ہوں وہ مبدأ فیاض سے قریب تر ہوں اور عالم ملکوت اعلیٰ سے متصل۔ وہ کلام نفسانی اور خطاب الٰہی سننے کی قابلیت رکھتے ہیں اور عالم ارواح وملائکۃ وعقول قادسہ وعقول فعالہ اسی میں داخل ہیں۔

یہ پہلے بیان ہوا کہ مافوق ماتحت پر موثر ومتصرف وحاکم ہوتا ہے نہ ماتحت مافوق پر۔ پس جو وجود کسی دوسرے وجود سے اقرب الی المبدأ اور مجرد تر ہو وہ اس سے

اخذ علوم وحقائق نہ کرے گا بلکہ برعکس۔ پس تمام ارواح کا علوم وحقائق کو بطور باطن ملائکہ سے اخذ کرنا اور وحی کا تعلق عالم ملائکہ پر موقوف ہونا جیسا کہ ابن خلدون نے حقیقت ولی میں لکھا ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ملائکہ کا تمام ارواح سے مجرد تر ہونا اور اقرب الی المبدأ ہونا ثابت نہیں بلکہ اس کے برعکس بعض ارواح کا

ملائکہ سے بدرجہا اشرف واکمل و اقوی وافضل و اعلیٰ و مجرد تر ہونا ثابت ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ از روئے قواعد عقلیہ سب سے زیادہ اقرب الی المبدأ اور سب سے اکمل واشرف و افضل و اقوی و اشدوا کد وجود وہ ہے جو وجود اولی ہو (مخلوق اول ہو) کیونکہ وہ مبدأ کمال سے بلاواسطہ غیر صادر ہوا ہے۔ جملہ علماء محققین کی شہادت دیانت اسلامی کی رو سے اول مخلوق روح نورانی محمدیؐ ہے۔ (بحارالانوار بصائر الدرجات) پس وہ اقرب وجود ہے اور اس سے مجرد تر کوئی وجود نہیں ہے اور اس کے اور خالق کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ پس لازم ہے کہ آنحضرتؐ تلقی کلام ربانی بلاواسطہ کریں بلکہ ہر ایک کے لئے آپؐ واسطہ فیض وافاضہ ہوں۔

اب ہمارے علماء کے نزدیک (مذہب امامیہ اثنا عشریہ) مسلم ومحقق ہے اور بعض احادیث حقیقت نور وروح کے باب میں موجود ہیں کہ حقیقت محمدؐ وآل محمدؐ ایک شے ہے اور آل محمدؐ کی خلقت بھی اسی نور اوّلی سے ہوئی ہے۔ یہ مشہور ومعروف ہی نہیں بلکہ اعتقادات میں شامل ہے۔ جیسے اول ما خلق الله نوری. اناو علی من نورٍ واحد چنانچہ زیارت جامع کبیر میں یہ فقرات تعلیم ہوئے ہیں۔

ان ارواحکم ونورکم واحدة وطابت وطهرت بعضها من

بعض۔ بے شک تمہارے ارواح اور طینت اور نور ایک ہی ہیں۔ جو پاک و پاکیزہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور اسی میں ہے۔ بکم فتح اللہ وبکم یختم۔ یعنی اے اہل بیت عصمت وطہارت تم ہی سے خدا نے خلق کی ابتدا کی اور تم ہی پر خاتم کرے گا اور بنا فتح اللہ وبنا یختم مکرر زبان آئمہ طاہرین سے صادر ہوا ہے۔

پس ارواح آئمہ طاہرین مثل روح پیغمبرؐ تمام ارواح سے خواہ وہ ملائکہ ہوں یا غیر ملائکہ افضل واشرف واعلیٰ اقویٰ اور مجردتر ہیں اور مثل محمد مصطفیٰؐ ان کے اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔

یہ ہستیاں نفوس ملائکہ اور عالم ملائکہ سے بالا ہیں یہ وہ نفوس عالیہ ہیں جہاں تک ملائکہ کی رسائی بھی نہیں۔ آیۃ مبارکہ میں یہ شواہد موجود ہیں۔ استکبرت ام کنت من العالین انکار وسجدہ آدمؑ پر خدا تعالیٰ نے ابلیس سے پوچھا کہ تو نے ازروئے تکبر (استکبار) سجدہ سے انکار کیا یا تو نفوس عالین میں سے ہے؟ جواب میں انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین کہا اور استکبار کا اقرار کر کے ثبوت بھی پیش کر دیا۔ مگر مجال نہ تھی کہ کہہ سکے کہ وہ عالین میں سے ہے۔ وہ ہمارے زمانے کے مدعیانِ علم کی طرح بے خبر نہ تھا اور خوب جانتا تھا کہ ان عالی نفوس میں سے نہیں ہے۔ جو عالم جن اور عالم ملائکہ دونوں سے بالا ہیں اور وہ مامور نہیں ہیں کہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔ یہ کون نفوس عالیہ ہیں جو سب سے بالا اور فوق درجہ رکھتے ہیں اور ملائکہ مقربین جبرئیل۔ میکائیل اسرافیل وغیرھم سے اعلیٰ وافضل واشرف ہیں۔

کیا سوائے ان نفوس طیبہ طاہرہ قدسیہ اہل بیت عصمت وطہارت کے کوئی اور ہو سکتا ہے؟ جن کے نور کی شعاع کے لئے جو پیشانی آدمؑ میں درخشاں تھی تمام

ملائکہ مقربین مامور بسجدہ تھے۔ یہ وہ نفوس عالیہ میں جنہوں نے بار بار فرمایا:

**سبحنا وسبحت الملائکۃ بتسبیحنا ولولا تسبیحنا مادرت الملائکۃ ما التسبیح؟**

ہم نے خدا کی تسبیح کی تو ہماری تسبیح سے ملائکہ نے خدا کی تسبیح کرنی سیکھی۔ اگر ہم تسبیح نہ کرتے تو ملائکہ نہ جانتے کہ تسبیح کیا ہوتی ہے۔ احادیث میں مذکور ہے کہ جب خلاق دو عالم نے نور الانوار سید الاولین والاخرین کو خلق فرمایا تو وہ نور ازلی محبوب لم یزلی ہزار سال تک خلاق عالم کے حضور میں کھڑا اور اس معبود حقیقی کی تسبیح و تقدیس کرتا رہا اور خلاق عالم اپنی نظر رحمت سے اس نور پاک کو دیکھتا رہا اور نظر رحمت فرماتا رہا۔ فرمایا اے میرے نور! تو ہی میرا محبوب ہے اور تو ہی میرا مقصود ہے۔ مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم ہے کہ اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو کوئی شی پیدا نہ کرتا۔ **لولاک لما خلقت الافلاک**۔ پس تیرا دوست میرا دوست ہے اور تیرا دشمن میرا دشمن ہے۔ پس نور رسول مقبول چمکا اور اس کی شعاعیں بلند ہوئیں۔ پس خلاق دو عالم نے اس نور پارہ 12 حجاب خلق فرمائے۔

حجاب قدرت۔ حجاب عظمت۔ حجاب عزت۔ حجاب ہیبت

حجاب جبروت۔ حجاب رحمت۔ حجاب نبوت۔ کبریائی

حجاب منزلت۔ حجاب رفعت۔ حجاب سعادت۔ شفاعت

پس اللہ نے اس نور مبارک کو ارشاد فرمایا کہ اے میرے حبیب حجاب قدرت میں داخل ہو جا۔

پس نور احمدیؐ حجاب قدرت میں داخل ہوا اور بارہ ہزار سال الوہیت تک

جس کا ایک دن پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان ربی الاعلی وبحمدہ

پھر حجاب عظمت میں داخل ہوا گیارہ ہزار سال یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان عالم السر والخفی۔

پھر حجاب عزت میں داخل ہوا دس ہزار سال الوہیت تک یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان الملک المنان۔

پھر حجاب ہیبت میں داخل ہوا نو ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان من ھو غنی لا یفتقر۔

پھر حجاب جبروت میں داخل 8 ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان الکریم الاکرم۔

پھر حجاب رحمت میں داخل 7 ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان رب العرش العظیم۔

پھر حجاب نبوت میں داخل 6 ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان رب العزۃ عما یصفون۔

پھر حجاب کبریائی میں داخل 5 ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان ربی العظیم الاعظم۔

پھر حجاب منزلت میں داخل 4 ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان العلیم الکریم۔

پھر حجاب رفعت میں داخل 3 ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان ذی الملک والملکوت۔

پھر حجاب سعادت میں داخل 2 ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان من یزیل الاشیاء ولا یزول۔

پھر حجاب شفاعت میں داخل 1 ہزار سال الوہیت یہ تسبیح پڑھتا رہا۔

سبحان ربی العظیم وبحمدہ۔

پس خلاق دو عالم نے نور محمدی سے 20 دریائے نور خلق فرمائے ہر دریا میں ایک علم تھا جس کو بجز خداوند عالم کوئی نہیں جانتا۔ پس خلاق دو عالم نے اس نور سرمدی حقیقہ کلیہ احمدی کو حکم دیا ان دریاؤں میں داخل ہو جا۔ وہ دریا یہ تھے۔

(1) دریائے عزت
(2) دریائے عصمت
(3) دریائے شجاعت
(4) دریائے سخاوت
(5) دریائے علم
(6) دریائے حلم
(7) دریائے صبر
(8) دریائے خشوع
(9) دریائے تواضع
(10) دریائے رضا
(11) دریائے وفا
(12) دریائے خشیت
(13) دریائے انابت
(14) دریائے امانت
(15) دریائے حیانت
(16) دریائے ہدایت
(17) دریائے عمل
(18) دریائے حیا
(19) دریائے مزید
(20) دریائے رسالت۔

حتیٰ کہ ان بیسوں دریاؤں میں سے وہ نور اطہر نکلا فقال عزوجل

والسابحات سبحا والسابقات سبقا والمدبرات امراہ o پس اللہ نے اس نور سرمدی کو مخاطب کر کے فرمایا اے حبیب تو میری پہلی مخلوق ہے اے خاتم المرسلین اے سرتاج اولین آخرین میں بروز قیامت تیرے سر پر تاج شفاعت رکھوں گا۔ پس جب اللہ نے اپنے حبیبؐ سے یہ فرمایا تو نور رسالت سجدہ شکر میں گیا اور جب سجدہ سے سر اٹھایا تو اُس سے ایک لاکھ ایک کم چوبیس ہزار نور کے قطرے ٹپکے پس خلاق دو عالم نے ہر ایک قطرہ سے ایک ایک پیغمبر کو خلق فرمایا پس کل انبیاء آپؐ کے گرد طواف کرنے لگے اور یہ تسبیح پڑھتے۔ سبحان من ھو عالم لایجھل سبحان من ھو حلیم لایجعل سبحان ھو غنی لا یفتقر۔ پس خلاق دو عالم نے ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آیا مجھے پہچانتے ہو؟ تو سب سے پہلے نور جناب رسالتمآبؐ نے عرض کیا انت اللہ الذی لا الہ الا انت وحدت لاشریک لک رب الارباب وملک الملوک۔ ہاں اے معبود تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور تیرا کوئی شریک نہیں اور تو رب الارباب اور کل بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ جب نور احمدی نے یہ عرض کیا تو خلاق دو عالم نے آپ کو ان انوار ہائے مقدسہ پر مبعوث فرمایا۔ پس آپؐ نے ان انوار طیبہ پر توحید اور اطاعت امر پروردگار کو پیش کیا تو سب سے پہلے آپ کی تصدیق نور علیؑ بن ابی طالبؑ نے کی۔ بعد ازاں دیگر انبیاء اوصیاء نے۔ پس یہ مطلب ہے حدیث شریف کنت نبیا و آدم بین الماء والطین o کا یعنی میں اس وقت نبی تھا جبکہ عالم عناصر ابھی درجہ قوت سے درجہ فعلیت میں نہیں آیا تھا۔ پس خلاق دو عالم نے علی ابن ابی طالبؑ کے نور کو صدیق اکبر کا خطاب عنایت فرمایا اور اس جناب

سرکار کا حامی و مددگار بنایا۔ سلطانا نصیرا ..... وفاروق اعظم کا..... لقب دیا

کیونکہ بروز قیامت وہی جناب (دونوں) اپنے محبوں کو عذاب نار سے چھڑائیں گے۔ القیا فی جھنم کل کفار عنید۔

پھر نور محمدیؐ ایک جوہر کو پیدا کر کے اس کے دو حصے کیے ایک حصے کو بنظر ہیبت دیکھا تو آب شیریں بن گیا اور دوسرے کو بنظر شفقت دیکھا تو عرش بن گیا۔ اس عرش کو اس پانی پر قرار دیا۔ یعنی پانی کو حامل عرش بنایا۔ پھر نور عرش سے کرسی۔ نور کرسی سے لوح۔ نور لوح سے قلم کو پیدا کیا۔ قلم کو حکم دیا میری توحید تحریر کرو اس حکم کو سن کر قلم بے ہوش ہو گیا ایک ہزار سال کے بعد جب ہوش آیا تو عرض کیا خداوندا کیا لکھوں فرمایا لکھو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ والاوصیاء المعصومین حجج اللہ۔ قلم یہ سن کر سجدہ میں گر گیا اور تسبیح باری بجالایا۔ سجدہ سے سر اٹھا کر یہ کلمہ شہادت لکھا۔ یا یوں کہوں کہ قلم نے کلمے کو سنتے ہی سجدہ کر کے عالم کو سبق دے دیا کہ یہ بھی قابل سجدہ (تعظیمی) ہیں یا سجدہ کر کے توحید باری کی عملی شہادت دی ہے اور کلمہ لکھ کر تحریری شہادت دی تا کہ نشان سجدہ کے ساتھ ساتھ نشان توحید بھی قائم و درخشاں رہے۔

اس کے بعد نور محمدیؐ سے بہشت کو خلق کیا اور اس کو چار اوصاف سے زینت بخشی تعظیم، جلالت، امانت، سخاوت اور عرش کے نور کو دو نوروں سے مزین کیا۔ نور فضل، نور عدل، نور عدل سے 4 چیزوں کو پیدا کیا۔ عقل، علم، حلم سخاوت عقل سے خوف و رجا کو پیدا کیا۔ علم سے تسلیم و رضا کو پیدا کیا۔ حلم سے مودت اور سخاوت سے محبت کو پیدا کیا اور ان اوصاف سے طینت محمدؐ و آل محمدؐ کا خمیر کیا بعدہ ارواح مومنین

کو۔ چاند، سورج، رات، دن روشنی سیاہی کو خلق فرمایا۔ پھر نوری محمدی سے ملائکہ کو پیدا کیا۔ فرمایا میرا نور ستر ہزار سال عرش پر تسبیح کر رہا۔ 70 ہزار سال بہشت میں 70 ہزار سال سدرۃ المنتہیٰ پر۔ 70 ہزار سال ساتویں آسمان پر۔ 70 ہزار سال چھٹے آسمان پر۔ 70 ہزار سال پانچویں تا آخر۔ ایک ہزار پہلے آسمان پر جب یہ تسبیح مکمل ہوئی تو اللہ نے یہ اعلان فرمایا۔ اے حبیب یاد کرو جب ہم نے زمین خلیفۃ کا اعلان کیا۔ اذ قال ربک للملائکۃ ان جاعل فی الارض خلیفۃ جناب آدمؑ میں روح پھونکی گئی تو انہوں نے تسبیح وتہلیل کی آواز سنی۔ پوچھا کیا ندا آئی یہ محمدؐ وآل محمدؐ عربی کی آواز ہے جو خیر اولین والآخرین ہیں۔ اے آدم میرے عہد کو لو اور اس کو رحمہائے پاکیزہ وشکمہائے طیبہ وپشتہائے طاہرہ میں رکھو۔ اس کے بعد حضرت حوا خلق ہوئی۔ وہ نور جس کو زبان قدرت نے عہد سے تعبیر کیا تھا آدمؑ کے ساتھ ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ حضرت حوا حاملہ ہوئیں۔ حضرت شیثؑ پیدا ہوئے تو نور محمدی جبیں مبارک میں چمکتا تھا۔ یہاں تک کہ جناب یافث تشریف لائے۔ ان کا عقد جنت کی حوروں نزلہ اور منزلہ سے ہوا جناب شیثؑ کے گھر لڑکا جناب یافثؑ کے گھر لڑکی۔ جوان و بلوغ پر ان کا عقد ہوا۔ جن سے حضرت انوشؑ پیدا ہوئے۔ یہاں تک یہ سلسلہ حضرت ہاشمؑ میں آیا۔

وہاں سے صاحب جناب عبدالمطلبؑ میں۔ یہاں آکر نور کے دو حصے ہوئے۔ ایک حصہ جناب عبداللہؑ کی طرف حصہ جناب ابوطالبؑ کی طرف منتقل ہوا۔

جناب عبداللہؑ سے سرکارؐ تشریف لائے جناب ابوطالبؑ سے جناب علیؑ تشریف لائے۔ جناب سرکارؐ سے جناب سیدۃ طاہرہ تشریف لائیں۔ جناب علیؑ سے

عقد ہوا۔ جناب حسنینؑ تشریف لائے۔ اب اللہ نے ان کا نام آل محمدؐ رکھ کر نماز میں درود واجب کر دیا۔ اب قیامت تک عبادت کی روح محمدؐ و آل محمدؐ ہیں۔ ان کی وجہ سے نماز کی صحت ہے۔ نماز کی مقبولیت ہے۔ بخشش ہے مغفرت ہے۔

☆☆☆☆☆

# درس ہفتم

درجات کا بلند کرنے والا وہی اللہ ہے جس کو جو درجہ چاہے عطا کرے۔ مسلم ہے کہ بشارت و نذارت کا تعلق رسولوں سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا۔ بعث رسولا مبشرین و منذرین۔ خدا نے رسولوں کو بھیجا جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے ہیں۔ یہ آیت مخصوص ہے سرکار دو عالم کے لئے فرمایا۔ انما انت منذر ولکل قوم ھادo سوائے اس کے نہیں کہ تو (ﷺ) منذر ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی مقرر ہے۔ ظاہر ہے کہ بشیر و نذیر ہونا ایک خاص روح پر موقوف ہے۔ جو عطیہ خاصہ الٰہیہ ہے اور وہ عالم امر سے ہے نہ عالم خلق سے اور یہ روح مخصوص ہے نبیؐ سے آیۃ مجید میں فرمایا۔ ویرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتو العلم درجاتo خدا بلند کرتا ہے درجات ان لوگوں کے جو تم میں سے ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا کر دیا گیا ہے۔

ثابت ہوا کہ رفعت درجات و حصول مراتب عالیہ ایمان اور علم پر موقوف ہیں اور ایمان خود فرع علم ہے اور علم مقدم ہے۔ لہٰذا رفعت درجات صرف علم پر موقوف ہیں۔ پس رفعت درجات نبوتی بھی علم ہی پر موقوف ہے اور اول معیار نبوت علم ہی ہے چنانچہ نبی اول اول نوع بشر (ابوالبشر) کے مقابلہ میں ملائکہ سے علم ہی کی بابت سوال

کیا گیا اور اسی میں ان کا امتحان لیا گیا اور اسی علم سے نبوت وخلافت آدمؑ ثابت ہوئی اور علم ہی کی وجہ سے مکرم ومعظم ومسجود ملائکہ قرار پائے۔

(1) نیز نبوت علم پر موقوف ہے اور علم ہی معیار نبوت ہے علم باعث رفعت درجات اور علم ہی اول کمال اور اکمل کمالات ہے۔ کوئی نبی اس سے خالی نہیں ہوتا۔

(2) معیار نبوت علم وھبی ہے نہ کسبی وتحصیلی۔ کیونکہ علم کسبیہ علوم ناقصہ ہوتے ہیں بلکہ اکثر غلط اور خلاف واقع ہوتے ہیں۔ پس ہر ایک نبی علم وھبی رکھتا ہے اور رفعت درجہ نبوت روح خاص (امری) نبوتی پر موقوف ہے۔ یہ خاص روح روح امری ہوتی ہے اسی سے نبیؑ بشیر ونذیر ہوتا ہے اور نبی کا علو درجہ ورفعت ومنزلت اسی روح کے ذریعہ سے ہے۔ جو دوسروں میں نہیں ہوتی۔ یہی روح ہے نفخت من روحی میں اور یہ ہی روح ہے۔ کلمۃ القاھا الی مریم وروح منہ۔ میں تمام انبیاء میں روح ہوتی ہے۔ وایدھم بروح منه. وینزل الملائکة بالروح علی من یشاء من عبادہ۔

اور حضرت خاتم النبیین علیہ السلام کے حق فرماتا۔ وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا ماکنت تدری ما الکتاب والایمان. ولکن جعلناہ نورا نھدی به من نشاء من عبادنا. وانک لتھدی الی صراط مستقیم۔

نبیؑ اور عام لوگوں میں مابہ الاحتیاز یہی روح نبوتی ہے اور یہ فصل ممیز ہے اور یہی روح اس کی ذات میں داخل ہے نہ کہ جدا اور وحی خاصہ ولازم روح نبوت ہے۔

اس مقام پر روح کی تشریح ضروری ہے۔ تاکہ اصل مسئلہ نبوت واضح اور کامل ثابت کیا جا سکے۔

محقق و مسلم ہے کہ روح لفظ عام و مشترک ہے۔ چنانچہ قوت جمود جمادی اور قوتِ نامیہ نباتی اور بخار لطیف حیوانی کو بھی روح کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ روحِ جمادی، روحِ نباتی، روحِ حیوانی۔ حالانکہ روح حیوانی یقیناً بخار لطیف کا نام ہے اور وہ جسم اور مرکب ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ ایک روح مرکب بھی ہے اور مجرد بھی۔ ایک مجرد ہے اور ایک مجرد تر اور ایک سب سے زیادہ مجرد۔ روح حیوانی مرکب ہے اور روح انسانی جس سے انسان انسان کہلاتا ہے۔ مفرد اور بہ نسبت اس کے مجرد اور اس سے جو روح فوق ہے وہ اس سے کہیں لطیف و مجرد ہے وہ روح نبوتی ہے اور اس کو روح قدس بھی کہا گیا ہے اور اسی پر مدارِ مطلق نبوت ہے۔ کوئی نبیؑ اس سے خالی نہیں ہوسکتا۔ ایک روح فوقِ جمیع ارواح قدس ہے اور وہ ان سب سے لطیف و مجرد تر۔ یعنی سب سے زیادہ مجرد یہ روح ہے۔

یہ روح ملاک و مدار ختم نبوت ہے کہ اس سے فوق ممکن کے لئے کوئی درجہ نہیں اور یہ روح مخصوص ہے خاتم النبیینؐ سے اور انبیاء میں یہ روح نہیں پائی جاتی۔

بالفاظ دیگر وہ ارواح قدس جو انبیاءؑ میں ہے (آدمؑ تا عیسیٰؑ) وہ ارواح قدس جزئی ہیں اور خاتم النبیینؐ میں یہ کل و کلی۔ بلکہ یہ ذات آفتاب عالم دہری ہے اور نور اس کا مستفاد ہے آفتاب سرمدی واجبی عزاسمہ سے۔ باقی ارواح اس کی شعاعیں ہیں۔ یہی روح مطلق اور روح اعظم مبدأ الارواح و ام الارواح ہے۔ کیونکہ یہی اول مصنوع صانع برحق اور اول مخلوق خالق برحق اور اول صادر از مصدر۔ مظہر کامل جلال و جمال خداوندی نقطہ دائرۂ تکوین و خاتمہ مصحف تدوین روح الارواح و نور الاشیاء مثل اعلائے الٰہی و کلمہ علیا و کلمہ تامہ غیر متناہی ہے۔ (وتمت کلمة ربک صدقا وعدلا)

پس اس کلمہ تامہ وجود یہ الٰہیہ کی تعریف و توصیف ممکن سے ناممکن ہے۔ اس کو وہ پہچانتا ہے جس نے ان کو خلق فرمایا ہے یا وہ خود اور ان کا نفس۔ کیونکہ علم ذات شی کے لئے ضروری ہے۔ ولذا قال یا علیؑ مَا عَرَفنی اِلاَّ اللّٰہُ وَاَنْتَ۔ رسولؐ نے فرمایا یا علیؑ مجھے یا اللہ نے پہچانا ہے یا تو نے۔ الخ

اگر تمام مخلوقات الٰہی تمام عمر اس کلمہ تامہ کی توصیف و تعریف لکھیں تو بھی ناقص و ناتمام رہیں۔ قل لو کان البحر مداداً لالکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مدداo

پس تمام انبیاء میں روح القدس جزئی ہے لیکن یہ روح اعظم جو ملاک و مواد ختم نبوت ہے۔ یہ مخصوص ہے سید المرسلین خاتم النبیینؐ سے۔ اس لئے انبیاء میں پانچ روحیں ہوتی ہیں اور آپؐ میں چھ روحیں ہیں پانچویں روح روح قدس کہلاتی ہے اور چھٹی روح روح کلی (روح قدس کلی) روح اعظم، روح امری، روح ختمی، روح مسدد کہلاتی ہے اور جمیع ارواح ماتحتہ مرکبہ و غیر مرکبہ تابع و مطیع روح قدس ہوتی ہیں اور اس کے ماتحت اور ان کے احکام استقلالیہ باطل۔ چنانچہ روح جمادی نباتی حیوانی تابع و تحت روح انسانی ہیں۔ اور ان کے افعال موافق حکم روح انسانی۔ اور اس کے تحت امر ظاہر ہوں گے نہ استقلالاً و انفراداً اور پیغمبرؐ میں روح جمادی و نباتی و روح حیات یا روح حیوانی و روح انسانی یا اصطلاح حکماء نفس ناطقہ انسانی سب تابع و مطیع و تحت حکم روح قدس نبوتی ہوں گے۔ یعنی وہ جامع ہے جمیع قوی کے ماتحت کو مع شی زائد۔ روح امری (ختمی) فوق جمیع ارواح و سیداً ارواح و ام الارواح ہے

بلکہ حیات جمیع ارواح و انوار اسی سے وابستہ ہے۔ کیونکہ وہی واسطہ مطلقہ

ہے درمیان خالق ومخلوق اور یہ بوجہ کمال تجرد ولطافت ہمیشہ اپنے مبدأ فیاض (خدا تعالیٰ) سے اتصال وتعلق رکھتی ہے اور اس کا مقام مقام قاب قوسین اوادنی ہے۔ یعنی امکان ذاتی سے گزر کر واجب غیری تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ واجب الوجود سے اس کا تعلق واتصال منقطع نہیں ہے۔ جس طرح کہ بلاتشبیہ شعاع آفتاب ذاتِ آفتاب سے جدا نہیں ہوسکتی۔ یہ آفتاب عالم امکان ہمیشہ شخص عالم سرمدی واجبی (سرکار دو عالمؐ) سے مستفید ومستفیض ہے اور اس میں کوئی مخلوق اس کا شریک نہیں۔ اس لئے معصومین نے فرمایا لنا مع اللہ حالات فی حالة نحن هو وفی حالة هو نحن و مع ذالک نحن نحن وهو هو۔ خدا کے ساتھ ہماری مختلف حالتیں ہیں کبھی ہم وہ ہوتے ہیں اور کبھی وہ ہم۔ لیکن باوجود اس کے وہ وہ ہی ہے اور ہم ہم ہی۔ وہ واجب ہم ممکن وہ قدیم ہم حادث وہ حی ہم ذی حیات وہ قیوم ہم قائم بالغیر وہ خالق ہم مخلوق وہ صانع ہم مصنوع وہ معبود ہم عبد وہ اللہ ہم مالوہ وہ رب ہم مربوب۔

بہرحال یہ روح اعظم (روح امری) مخصوص ومختص ہے جناب خاتم النبیینؐ سے اور ان کی اولاد طاہرین ومعصومینؑ سے اور کسی کو یہ روح نہیں دی گئی۔ حضرت ابو عبداللہؑ سے اس روح کے بارے میں دریافت کیا۔ تو فرمایا خلق اعظم من جبرئیل و میکائیل کان مع رسولؐ اللہ وهو مع الائمةؑ وهو من الملکوت اور دوسری روایت میں ہے خلق اعظم من جبرئیل ومیکائیل لم یکن مع احدٍ ممن مضی غیر محمد صلی اللہ علیه وآله وسلم وهو مع الائمة لسیددهم ولیس کل ما طلب وجد۔ جس کا صریح مفہوم

یہی ہے کہ یہ روح جس کا ذکر وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا وغیرھا آیات میں ہے۔ ایک روح خاص روح اعظم اور انبیاء سابقین میں سے کسی کے ساتھ نہ تھی۔ بلکہ یہ مخصوص ہے آنحضرتؐ اور ان کی اولاد طاہرین آئمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام سے اور یہ دلیل بین ہے کہ آئمہ معصومینؑ جمیع انبیاء سابقین سے افضل ہیں۔

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب وہی روح اعظم آئمہؑ میں بھی ہے تو وہ سب کے سب نبی کیوں نہیں؟ اور ایک زمانے میں دو بزرگوار کیونکر موجود ہوتے ہیں؟

جواب: احتجاج طبرسی۔ عن جابرٍ قال سلت ابا جعفر علیه السلام عن الروح قال یا جابر ان الله خلق الخلق علی ثلاث طبقات وانزلهم ثلث منازل وبین ذالک فی کتابه حیث قال واصحاب المیمنة ما اصحاب المیمنة واصحاب المشئمة ما اصحاب المشئمة والسابقون السابقون اولئک المقربون فاما ما ذکر من السابقین فهم انبیاء مرسلون. جعل الله فیهم خمسة ارواحٍ۔

جابرؓ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روح کی بابت سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا اے جابر اللہ تعالیٰ لوگوں کو تین طبقوں میں خلق فرمایا ہے اور تین درجوں میں رکھا ہے اور اس کو اپنی کتاب (قرآن) (سورہ واقعہ پ 27) میں ظاہر فرمایا ہے جہاں کہ فرمایا ہے کہ ایک اصحاب یمین یعنی ابرار (نیک لوگ) ہیں ایک اصحاب شمال (گنہگار) اور تیسرا گروہ سابقین کا ہے اور وہی مقربین ہیں۔

پس جو سابقین مقربین بیان کئے گئے ہیں وہ انبیاء مرسلین واوصیاء کرام ہیں۔ان میں اللہ تعالیٰ نے پانچ روحیں رکھی ہیں۔

1- روح الحیات۔

2- روح القوۃ۔

3- روح الشھوۃ۔

4- روح الایمان۔

5- روح القدس۔

اللہ تعالیٰ نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض اور بعض کو بعض پر درجات عطا کئے۔پس روح القدس ہی کے ساتھ انبیاء ومرسلین بھیجے۔ وایضاً عن جابر بن یزید الجعفی الکوفی قال قال ابو جعفر علیه السلام ان الله خلق الانبیاء والائمة علی خمسه ارواح (روح القدس روح الایمان روح القوة روح الشهوة روح البدن) فروح القدس من الله وسائر هذه الارواح یصیبها الحدثان وروح القدس لا یلهو ولا یتغیر ولا یلعب ولا یغفل. فروح القدس علموا یا جابر مادون العرش الی تحت الثری۔فرمایا اے جابر اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ واٰئمہؑ میں پانچ روحیں خلق فرمائی ہیں۔روح القدس، روح ایمان، روح شہوۃ، روح قوت، روح بدن پس روح القدس تو اللہ سے ہے یعنی اس کی خاص برگزیدہ روح ہے اور اس عالم کثیف جسمانی سے نہیں ہے۔باقی تمام ارواح پر حوادثِ زمانیہ طاری ہوتے ہیں اور اثر کرتے ہیں اور روح قدس نہ تو لہو ولعب میں مشغول ہوتی ہے اور نہ اس میں تغیرات

واقع ہوتے ہیں کہ کبھی کچھ کبھی کچھ ہوگئی۔ وایضاً

عن مفضل عن ابی عبدالله علیه السلام قال یا مفضل ان الله تبارک وتعالی جعل للنبی خمسة ارواح. روح الحیوة فیه رب ودرج وروح القوة فیه نهیض وجاهد وروح الشهوة فیه اکل و شرب وانی الی النساء من الحلال وروح الایمان فیه امر وعدل و روح القدس فیه حمل النبوة (الی ان قال) وروح القدس لا ینام ولا یَغفل ولا یلهو ولاربعة ارواح تنام وتلهو وتغفل وتسهو. وروح القدس ثابت یری به فی شرق الارض وغربها و برها وبحرها الخ۔ امام جعفر صادقؑ نے مفضل سے بیان فرمایا اے مفضل اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کے لئے پانچ روحیں بنائی ہیں۔

## 1-روح الحیات

روح حیات سے چلتا پھرتا اور حرکت کرتا ہے۔ اس روح الحیاۃ کا دوسرا نام روح البدن ہے۔ اسے روح المدرج بھی کہتے ہیں۔ مدرج کے معنی سیڑھی معصیت سے پرہیز کرتا ہے۔

## 2-روح القوۃ

صاحب روح اس سے اٹھتا اور جہاد کرتا ہے اور اطاعت معبود کرتا ہے۔

## 3-روح الشھوۃ

طیب وطاہر چیزیں جس سے کھاتا پیتا اور عورتوں سے بطریق حلال خلوت کرتا ہے۔ عبادت و پرہیز گاری کی خواہش.....

## 4-روح الایمان

صاحب روح جس سے امر و نہی و عدل و انصاف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اور معصیت سے پرہیز کرتا ہے۔

## 5-روح القدس

جس سے بھار نبوت کو اٹھاتا ہے۔ یہ روح قدس ہی متحمل نبوت ہو سکتی ہے۔ اس لئے غیر معصوم کبھی بھی مستحق عہدہ نبوت نہیں ہو سکتا۔ روح قدس نہ سوتی ہے نہ غافل نہ لہو و لعب میں مشغول اور باقی چار روحوں پر لہو و لعب سہو و غفلت طاری ہوتی ہے اور روح قدس ثابت و قائم رہتی ہے جس سے مشرق و غرب۔ خشک و تر کی چیزیں دیکھتا ہے۔

اصول کافی بصائر الدرجات: وفی المومنین اربعة ارواح. روح الایمان. روح القوة. روح الشهوة. روح البدن۔

یہی روح القدس جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ تمام انبیاء کے لئے فرمایا۔ ایدناهم بروح القدس. وایدهم بروح القدس۔ جناب عیسیٰ نے فرمایا۔ وایدهٗ بروح القدس۔

اسی روح القدس کے آنے سے صاحب روح القدس میں چار کمالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس روح القدس سے نبی کلام خدا سنتا ہے اور اس سے وہ ملائکہ کو دیکھتا ہے اور اس سے وساوس شیطانی سے محفوظ رہتا ہے کہ شیطان یہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس روح قدس سے وہ عالم مواد میں تصرف رکھتا ہے اور اس روح کے ذریعہ وہ

علوم حاصل کرتا ہے۔ نہ حواس وقوائے ظاہریہ جسمانیہ کے ذریعے جن سے عام انسان کرتے ہیں اور روح قدس عالم ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے حکماء نے کہا ہے کہ نبیؑ میں اس سے چار (4) خصلتیں خاص (کمالات) پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو اس کو عام انسانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

1- یسمع کلام اللہ.

2- یری ملائکۃ اللہ.

3- یعلم جمیع العلوم او اکثرھا من اللہ.

4- وتطیعہ ماوۃ الکائنات۔

اس کی وجہ نبی کلام خدا سنتا ہے۔ فرشتوں کو دیکھتا ہے۔ تمام علوم یا اکثر علوم (حسب ضرورت زمان) منجانب اللہ جانتا ہے۔ یعنی بعلم لدنی اور موادِ کائنات مثلاً عناصر اربعہ اس کے مطیع ہو جاتے ہیں۔ جو حکم دے وہی عمل میں آجائے گا اور جو کہے گا وہی ہو جائے گا اور یہ سب اس کے معجزات کہلائیں گے۔ لہٰذا اس روح قدس کے ذریعہ نبی جو کچھ کر سکتا ہے ملائکہ بھی نہیں کر سکتے۔

اصول کافی بحار الانوار۔ اسی روح قدس کو (عصمت) لازم ہوتی ہے۔

اس روح القدس کے علاوہ ایک (روح ختمی) بھی ہے۔ وہ روح اعظم اور روح مسدد کہلاتی ہے اور چھٹی روح شمار ہوتی ہے اس روح کے کئی نام ہیں۔

1- روح القدس کلی۔

2- روح اعظم۔

3- روح ختمی۔

4- روحی امری۔

5- روح مسدد۔

یہ روح ختمی مخصوص ہے سرکار دو عالمؐ اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کے لئے اس روح امری سے یہ صاحبان بوجھ ختم نبوت اور بوجھ امامت مطلقہ کو اٹھاتے ہیں۔ اسی روح امری کا قرآن میں ذکر ہے۔

1- وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان.

2- رفیع الدرجات ذوالعرش یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ.

3- یسئلونک عن الروح؟ قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاo

4- تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر۔

یہ روح مسدد ہے۔ یہ روح اعظم ہے۔

آئمہ طاہرینؑ بھی مثل انبیاء روح قدس کے حامل ہوتے ہیں اور وہی روح قدس حامل امامت اور روح مسدد بعد رسول اللہ ان کی موید و مسدد رہتی ہے۔ تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر اس کی طرف اشارہ ہے۔

**وضاحت:** یہاں پر ایک پوشیدہ مسئلے کی وضاحت ضروری ہے کہ احادیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے چند روحیں ہیں اور نبیؐ میں ان سے زیادہ ایک روح قدس ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان میں دراصل ایک ہی روح ہے۔

یعنی یہ کہ انسان میں اصطلاح حکماء میں جو روح نباتی۔ روح حیوانی و روح انسانی کہی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روح نباتی۔ روح حیوانی و روح انسانی علیحدہ علیحدہ روحیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان جو فوق حیوان ہے اس میں ایک ایسی روح ہوتی ہے جو جامع ہے جملہ کمالات و قویٰ ماتحت حیوان و نبات کو مع شی زائد اس میں (روح انسانی) قوتِ انشاء ہے۔ تحریک ہے۔ احساس ہے۔ ادراک ہے مع نطق یعنی بیان جو دوسرے حیوان میں نہیں ہے اور اس روح انسانی سے دوسرے حیوانوں سے ممیز و ممتاز ہو جاتا ہے۔ پس روح انسانی جامع ہے روح جمادی روح نباتی روح حیوانی کو۔ یہ سب صفتیں اس روح میں موجود ہیں۔ جن کو علیحدہ علیحدہ ارواح سے تعبیر کیا گیا۔ اسی طرح احادیث مذکورہ میں بغرضِ افہام و تفہیم و اعلام و تعلیم۔ پس مطلب یہی کہ نبی میں وہ روح (قدس) ہوتی ہے جو جامع اپنے ماتحت کے جملہ ارواح کی ہے۔ مع زیادہ قوتِ قدسیہ جس قوتِ قدسیہ (روح قدس) کا اثر کلام الٰہی سنتا۔ وحی الٰہی کو اخذ کرنا اور بار نبوت کو اٹھاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ نبی کی روح کامل و اکمل ہوتی ہے تمام ارواح سے۔ جو اس کے ماتحت انواع میں کمالات ہوتے ہیں وہ سب اس میں موجود ہوتے ہیں مع شی زائد۔ اسی طرح خاتم النبیین علیہ السلام میں روح قدسی کلی (روح امری۔ روح ختمی) ہوتی ہے جو جامع کمالات و صفات ہے اپنے ماتحت جملہ ارواح کی مع زائد قوتِ امری۔ (روح امری) روح اعظم۔ (یہ روح امری۔ کسی بھی نبیؑ یا ملک میں نہیں ہوتی) یہ صرف اور صرف مخصوص ہے خاتم النبیینؐ کے لئے اور ان اولاد طاہرین آئمہ معصومین علیہم السلام کے لئے جیسا کہ حدیث پاک ہے۔ **وھو روح وھو اعظم من جبرئیل و میکائیل الخ**۔ وہ روح ہے ملک نہیں ہے۔ وہ اعظم و اقرب و افضل

ترین ہے۔ ملائکۃ مقربین سے بھی اعظم وافضل ہے۔ یہ روح جو کچھ کرسکتی ہے وہ مقرب ومعظم فرشتے بھی نہیں کرسکتے۔ اس کے افعال ان ملائکۃ کے مقابلہ میں بھی معجزہ ہونگے اور ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس روح کی بدولت اور اس کی قوت وطاقت سے مع جسم سرکارؐ وہاں پہنچے جہاں جبرئیل امین نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اس مقام سے کہیں نیچے رک جاتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ لودنوت انملة فاحترقت۔ اب یہاں سے پورا بھر اگر اوپر جاؤں تو آتش قہر وغضب الٰہی سے جل جاؤں یا حدت نور (روح امری) سے جل جاؤں۔ جیسا کہ قرآن میں اس روح امری کو نور کہا گیا۔ ولکن جعلناہ نورا نهدی به من نشاء من عبادنا وانک لتهدی صراط مستقیمo شوریٰ سوال (اعتراض) بعض حضرات ومفسرین نے اس روح سے مراد جبرئیل (ملک) لیا ہے۔ مثلاً وکذالک اوحینا الیک روما من امرنا ما کنت تدری ' الکتاب ولا الایمان. 2- تنزل الملائکة والروح فیها باذن ربهم من کل امر۔ آیات کریمہ میں روح سے مراد ملک لیا گیا ہے۔ جو کئی وجوہ وطرق سے درست وصحیح نہیں ہے۔ کیونکہ انبیاء ودیگر ناس میں مابہ الامتیاز یہی روح القدس ہے اور ان کی ترقیاتِ اعلیٰ کا ذریعہ رفیعہ یہی ہے۔ اگر اس کو ملک ہی مراد لیا جائے تو بڑا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ دیکھو کتاب مستطاب اصول کافی ص 168 میں ایک حدیث ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک شخص نے جناب امیرؑ سے اس روح کی نسبت دریافت کیا کہ آیا وہ از جنس ملائکہ ہے؟ تو آپ نے اس کی نفی فرمائی۔ روایت عن سعید الاسکاف قال اتی رجل الی امیر المومنین لیساله عن الروح الیس هو جبرئیل؟ فقال له امیر المومنینؑ جبرئیل من الملائکة

والروح غیر جبرئیل فکرر ذالک علی الرجل۔ سعید الاسکاف سے روایت ہے اس نے کہا ایک شخص جناب امیر المومنینؑ کے پاس آیا اور اس نے اسی روح کے بارے میں سوال کیا آقا! کیا یہ روح جبرئیل نہیں ہے؟ (یعنی روح سے مراد جبرئیل ہے؟) تو جناب امیر المومنینؑ نے فرمایا اے شخص جبرئیل ملائکہ میں سے ہے اور روح غیر جبرئیل۔ یعنی (روح جبرئیل نہیں ہے) اسی بات کو اس مرد کے سامنے جناب علیؑ نے کئی بار دھرایا۔

نمبر2 تفسیر صافی ص 365 میں بھی ایک مضمون تقریباً اسی معنی پر دال ہے۔ قال اللہ تعالیٰ تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر. الخ وعنہ علیہ السلام قال ان الروح اعظم من جبرئیل وان جبرئیل من الملائکۃ وان الروح ھو خلق اعظم من الملائکۃ الیس یقول اللہ تعالیٰ تنزل الملائکۃ والروح الخ۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام آیۃ مجیدہ تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کلامر۔ کے بارے میں پوچھا گیا تو جناب نے فرمایا یہ روح اعظم ہے جبرئیل سے جبرئیل ملائکہ سے ہے اور یہ روح خلق اعظم من الملائکہ ہے۔ فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرما رہا تنزل الملائکۃ والروح!

پس معلوم ہوا کہ روح سے مراد جبرئیل یا کوئی فلک مراد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وکذالک اوحینا الیک روحامن امرنا ماکنت تدری ما الکتاب والایمان ولکن جعلناہ نوراo یہی روح سے مراد روح خاص ھو اعظم من جبرئیل و میکائیل ہے۔ ہیں روح ہمری، روح قدس کل، روح ختمی، روح مسدد

ہے۔ یہی روح امری مطلق نوراللہ ہے اور کمالِ محض ہے۔ جو جملہ اشیاء عالمین سے پہلے خلق ہوئی ہے اور آدمؑ سے چودہ ہزار سال قبل تسبیح خدا ادا کی۔ یہ وہ عطیہ خاصہ خدائی ہے کہ جس پر تمام کمالاتِ نبوت کی مدار ہے۔ عرش معلیٰ سے لیکر تحت الثری تک کی باتیں اسی کی وجہ سے معلوم ہوتی ہیں۔ عالمین کے لئے بشیر ونذیر ہونا اور فرقِ سرتا ناخن پا رحمت مجسم ہونا اسی روح امری کلی نبوتی کا نتیجہ ہے اور یہی علت نمائی ممکنات ہے اس کے نہ ہونے میں نہ علم کا نشان تھا نہ ایمان کا نام' کون جانتا' کہ اسلام کیا ہے؟ اور خدا کون ہے! بھلا کس کو احساس ہوتا جبکہ واجب الوجود کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا پیدائش عوالم کا واسطہ یہی ہے اور یہی حقیقت کتاب وتعریف ایمان۔

اس سے پہلے سوائے علم باری کے اور کہیں علم وایمان کا وجود نہ تھا۔ یہ روح پاک اس وقت بھی خدا کی تسبیح خواں تھی جب وقت اور زمانے کا اطلاق نہ تھا اور جب یہ جملہ اصول اسی سے وابستہ ہیں تو بالکل صحیح ہے خدا کا فرمانا **ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان** یعنی تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب (کتاب اور کیا ہے ایمان؟) بھلا جانتے کہاں سے۔ جب ان کے خلق ہونے سے پہلے سوائے ایک خدا کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے پیدا ہوتے ہی سب کچھ ہوگیا۔ فلسفہ اور عقل کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ کامل سے بلاواسطہ کامل ہی صادر ہوتا ہے۔ (حکماء کا یہ مسئلہ کہ **الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد** ۔ واحد سے واحد ہی صادر ہوتا ہے۔ ذات بسیط (خدا تعالیٰ) سے دو مصنوع صادر ہوں تو کثرت لازم آئیگی کیونکہ اس حیثیت سے کہ خالق زید ہے مثلاً اور ہوگا اور اس حیثیت سے کہ خالق عمرو ہے اور ہوگا۔ کیونکہ ایسی کثرتِ حیثیتی تو ایک مخلوق ومصنوع کے صادر ہونے سے بھی لازم آتی ہے۔

الخیر لا یصدر عنه الا الخیر۔ خیر سے صرف خیر ہی صادر ہوتا ہے۔ اللہ کامل بالذات ہے اس لئے اللہ کا پہلا مخلوق کامل ہی ہوگا۔ اللہ کے پہلے مخلوق کو خالی از علم یا خالی از قدرت قرار دینا اس بات کا مترادف ہے کہ معاذ اللہ اللہ کی ذات بھی علم و قدرت سے خالی ہو۔ یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تو کامل بالذات ہے لیکن وہ مخلوق اول کو کمال دے نہیں سکا یا مخلوق اول میں کمال کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ تھی ان دونوں صورتوں میں اللہ کا عجز لازم آئے گا جو محال ہے۔ اس لئے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اللہ کا پہلا مخلوق تمام کمالات سے متصف تھا جو ایک ممکن کے لئے ہو سکتے ہیں۔

دوسری وجہ: ما کنت تدری ما الکتاب و الا الایمان۔ کے فرمانے کی یہ ہو سکتی ہے کہ جب تاجدار لولاک لما خلقت الافلاک کی خاطر عاطر سے سب کچھ نیست سے ہست ہوا ہے اور مقصود پیدائش مخلوقات سے عبادت ہے اور عبادت کے اعلیٰ لوازم سے علم ہے اور علم سے فائدہ حصول ایمان کا ہے اور آپؐ ہی حقیقت علمیہ ہیں تو جب آپؐ کی روح نبوتی کو خدا موجود نہ کرتا تو یہ جملہ اسباب معدوم تھے بلکہ وہ تمام کمالات جو آنحضرتؐ کے وجود سامی میں موجود ہیں جو سوائے اس ذیشان کے اور کسی کو کم نصیب ہوئے ہیں۔ وہ بھی تو اس روح نبوتی کے باعث ہیں۔ پس بالفرض اگر ایسی روح سے آنحضرتؐ محروم رہتے تو کچھ بھی ظہور میں نہ آتا۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ایک ایسی روح کی ودیعت تجھ میں کی ہے کہ تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور کیا ہے ایمان۔ یعنی اگر ایسی روح نہ عطا کی جاتی تو اس صورت میں تو کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ بلکہ کچھ بھی نہ تھا (موجود نہ تھا)۔ اب اس کے ہونے سے تمام منزلیں مقصود کی طے ہو گئی ہیں۔ پس یہی ایک آیت ہے جو

کمالاتِ نبوت اور فضیلت خاص آنحضرتؐ یعنی علت غائی ممکنات کے ہونے پر دلالت صریح ہے۔ حیف ہے ان لوگوں پر جو اس آیت مجیدہ سے چالیس برس کے عرصے تک (سرکارؐ عالم) کو جاہل محض ہونا (معاذ اللہ) ثابت کرتے ہیں۔

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا۔

اس میں شک نہیں کہ جبرئیلؑ اس وقت آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے جب کہ آپ کا سن چالیس برس کا تھا اور آپؐ مظہر رسالت ونبوت ہوئے ہیں۔ چونکہ علم کتاب وحقیقت ایمان کا موقوف ہونا وحی روحی پر ہے اور قبل ازاں اس کی نفی کی گئی ہے بالفاظ ظاہر (ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان) اور بعض مفسروں نے (اس وحی روح) یعنی وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا۔ سے جبرئیلؑ کو مراد لیا ہے۔ پس اس معنی کے مسلم ہونے سے چالیس برس کے عرصے تک آنحضرتؐ کا (معاذ اللہ) جاہل محض رہنا ثابت ہوا اور علم کتاب وحقیقت ایمان سے واقف ہونا بواسطہ جبرئیل تھا جب تک جبرئیل نہ آیا آپؐ کو ہرگز ایمان وکتاب سے آگاہی نہ تھی دوسرے لفظوں میں حسب رائے مفسروں کے (معاذ اللہ) سرکارؐ بے ایمان ہی تھے۔ نعوذ باللہ من ذالک لاعتقاد۔ اس اعتقاد کی بنا پر چند اشکال پیدا ہوتے ہیں۔

**اوّل:** حضرت آدمؑ کو جناب خاتم النبوۃ پر فضیلت ہوئی کہ وہ بمجرد نفخ روح (صرف نفخ روح سے) مسجود ملائکہ اور معلم من اللہ ہوئے اور جمیع ملائکہ حتی جبرئیلؑ بھی ان کے علم وفضیلت کے آگے عاجز ٹھہرے اور ابلیس ان کے سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے مطوق بلعن ہوا کہ یہ کمال فضل اور ترجیح حضرت آدمؑ کی دلیل

ہے۔اور سرکارؐ (معاذ اللہ) چالیس برس کے عرصے تک جاہل محض رہے ہیں۔

**دوم:** حدیث۔ کنت نبیا وآدم بین الماء والطین کی تکذیب لازم آتی ہے۔ نیز اُن احادیث کی جو طرفین سے مروی ہیں کہ نور آنحضرتؐ پیدائش حضرت آدمؑ سے کئی سال پیشتر خلق ہوا ہے اور اس وقت تسبیح وتقدیس خدا کی ادا کی ہے جب کوئی تسبیح وتقدیس ادا کرنے والا نہ تھا اور جملہ اشیاء عالم اس محمد ﷺ کے واسطہ سے پیدا ہوئیں اور فرشتوں کو بھی توحید خدا کا سبق پڑھایا۔ پس عالم انوار میں تو وہ عزت کہ جس کی حد نہیں اور عالم دنیا میں یہ ذلت کہ (معاذ اللہ) چالیس برس تک علم کتاب وایمان سے عاری رہے؟

**سوم:** آنحضرت اور عوام میں کوئی فرق نہ رہا۔ ان سے عین مساوات لازم آئی جنہوں نے بعد حالِ [illegible] کے ایمان حاصل کیا۔ متدبروا

**چہارم:** عصمت وطہارت قائم نہ رہی اور ممکن ہے کہ یہ سبب نہ جاننے کتاب وایمان کے فی وقت مس الاوقات مرتکب معاصی وآثم ہوئے ہوں۔

**پنجم:** انبیاء علیہم السلام جو ان سے باعتبار فضیلت کم رتبہ رکھتے ہیں مثلاً حضرت عیسیٰؑ و جناب یحییٰ علیہ السلام وہ تو بچپن ہی میں حامل نبوت ہو گئے اور ان کو کتاب بھی دی گئی اور ایمان سے بھی مشرف۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ عیسیٰؑ نے بچپن ہی میں اپنے نبی ہونے کی گواہی بزبانِ خود ادا کی۔ انی عبداللہ آتانیَ الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکا اٰمن ما کنت۔ یعنی میں بندہ خدا ہاں مجھے خدا نے کتاب (علم وجودی) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور ہر حال میں اور ہر جگہ مجھے صاحب برکت قرار دیا ہے۔ پ 16 مریم۔ بقول بعض محققین شکم مادر خدا نے عیسیٰؑ کو انجیل کی

تعلیم دی تھی۔ (دیکھیں تفسیر عمدۃ البیان زیر آیۃ مذکورہ)

اسی طرح حضرت یحیٰؑ کے حق میں ارشاد فرماتا ہے۔ یا یحی خذالکتاب بقوۃ واتیناہ الحکم صبیا۔ یعنی اے یحیٰ پکڑ لے تو کتاب (تورات) کو ساتھ قوت کے اور بچپن ہی میں ہم نے ان کو حکم (نبوت) عطا کر دیا۔ (پ16 مریم)

تین برس کے عرصے میں حضرت یحیٰؑ کو نبوت ملی۔ (عمدۃ البیان)

اور حضرت افضل الانبیاء چالیس برس کے عرصہ تک ایمان و کتاب سے محروم رہے ہیں۔ (معاذ اللہ)

**ششم**: جبرئیلؑ فضیلت میں زیادہ ہوئے کہ بواسطہ نزول اس کے آپ علم کتاب و حقیقت ایمان سے واقف ہوئے ہیں۔ جب تک وہ (جبرئیل) نہ آیا آپؐ مطلق بے خبر تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے اور کتاب کس کو کہتے ہیں۔ گویا جبرئیلؑ ہی تعلیم کا اصل ذریعہ ہوئے۔ باوجود اس امر کے کہ جبرئیل آپؐ کے وصی و جانشین کے شاگردوں سے تھا اور خاص کر عالم انوار میں تسبیح و تقدیس کا سبق بھی ان سے پڑھا تھا اور اس کی پیدائشی اصل کا موجب بھی یہی تھا۔

**ہفتم**: جناب امیرؑ کے وہ تمام معجزات جو قبل ولادت اور روقت ولادت منقول ہیں یعنی وقت ولادت بلکہ قبل از ولادت تلاوتِ قرآن کرنا بالکل باطل ہو گے۔ روایت. لما تولد علی نظر الی النبیؐ ضاحکا وسلم علیہ وجعل یقرء القرآن قبل نزولہ عند حضور الاعیان۔ جب حضرت علیؑ متولد ہوئے تو سرکارؐ دو عالم کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا اور حضورؐ کو سلام کیا اور قرآن پڑھنا شروع کر دیا جبکہ ابھی نزول قرآن ہوا ہی نہ تھا۔ تمام حاضرین کے سامنے تلاوت فرمائی۔ کیونکہ نبیؐ

جب چالیس برس تک یہ نہ جانے کہ قرآن کیا ہے اور نہ حقیقت ایمان سے آگاہ ہو۔ تو اس کا وصی کیسے قبل از نزول تلاوت کر سکتا ہے اور اگر کرے بھی تو کسی کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ قرآن پڑھ رہا ہے۔ نبی کو تو ابھی خبر نہیں کہ قرآن کوئی چیز ہے۔ پس اوحینا الیک روحا من امرنا سے نہ جبرئیل مراد ہے نہ قرآن جن لوگوں نے روح کے یہ معانی کیے ہیں وہ سخت دھوکے میں آئے ہیں اور لفظاً و معناً گرفتار ہو گئے ہیں۔

لفظاً: اس لئے کہ قرآن میں جہاں روح امری واقع ہوا ہے اس سے روح قدس نبوتی مراد ہے۔ چنانچہ فرمایا!

رفیع الدرجات ذوالعرش یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ لینذر یوم التلاق۔ (پ 24 المومن) یعنی رفیع الدرجات صاحب عرش روح القا کرتا ہے اپنے عالم امر سے اس شخص پر جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے۔

ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیم من العلم الا قلیلاً۔ (پ15 بنی اسرائیل) یعنی سوال کرتے ہیں تم سے اے رسولؐ! بات روح کی تم کہہ دو کہ روح میرے رب کے عالم امر سے ہے اور تم لوگوں کو قلیل ہی علم عطا کیا گیا ہے۔ وما اوتیم من العلم الا قلیلا۔ سے ظاہر ہے کہ سوال روح نبوتی کے بارے میں تھا اور چونکہ نبیؐ اس کے کمالات پر حاوی ہوتا ہے اور اس کی منزل کا عارف اور عوام اس کی کہنہ و کیفیت کے مدرک نہیں ہیں۔ اس لئے نبیؐ کو یہی کہنا ہوا کہ تم تو بہت کم علم دے گئے ہو اور آپؐ کو اس قلیل العلمی میں داخل نہیں کیا یعنی یوں نہیں کہا گیا۔ وما اوتینا من العلم الا قلیلا۔ کہ ہمیں تو علم قلیل دیا گیا ہے۔ پس

عام روح انسانی اس آیت میں مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی حقیقت سے تو محققین کا واقف ہونا ممکن ہوسکتا ہے۔

صاحب تفسیر قمی۔ تفسیر صافی۔ تفسیر البرہان وغیرہ بلکہ تفسیر عمدۃ البیان میں اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ حضرت صادقؑ نے اس روح کی نسبت ارشاد فرمایا کہ وہ ایک خلق ہے کہ اعظم ہے جبرئیل و میکائیل تمام ملائک سے وہ محمدؐ کو عطا کی گئی ہے اور جب سے آئی ہے واپس نہیں گئی اور بعد ان کے یکے بعد دیگرے تمام آئمہ علیہم السلام کے ہمراہ رہی ہے۔ اور

معناً: اور معناً یوں گرفتار ہوئے کہ جب روح سے جبرئیلؑ یا قرآن مراد لیا جائے تو قبل ازاں آنحضرتؐ کا کتاب و ایمان سے جاہل محض ہونا ثابت ہوگا کہ عرصہ چالیس برس تک علم کتاب و حقیقت ایمان سے مطلق بے خبر رہے ہیں۔ کیونکہ جس طرح علی العموم وحی روح سے جبرئیل و قرآن مراد لی جاتی ہے ویسے اس امر کا اعتراف کہ نزول جبرئیل و قرآن اس وقت میں ہوا ہے جبکہ سن آنحضرتؐ کا چالیس برس کا تھا۔ نیز وہ اشکال عائد ہونگے جو مذکور ہو چکے ہیں۔ **وذالک اعظم من شان النبوۃ۔** بہرکیف (روحا من امرنا) سے روح قدس نبوتی مراد ہے۔

سابقہ سوال: جب روح بعد رسولؐ آئمہ طاہرین میں موجود ہے تو پھر ان کو نبی

(1) کیوں نہیں کہا جاسکتا؟

(2) اور کیا وجہ ہے کہ اُن کا وجود مسخود یکے بعد دیگرے بعد از وفات پیغمبر مخلق نہیں ہوا تا کہ وہی روح نورانیہ اپنے محل سابق سے منتقل ہو کر ان اجسام طاہرہ میں داخل ہوئیں؟

جواب: روح اور ملک دو جدا جدا لفظ ہیں۔ جو دو مختلف چاہتوں در حقیقتوں کے لئے وضع ہوئے ہیں اور یہ مشہور و معروف ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ روح اور شی ہے اور فرشتہ ایک اور چیز۔ اس لئے کسی فصیح کے کلام میں روح کسی ملک کے واسطے نہ بولا جائے گا۔ اگر بولا جائے گا تو کسی محاذ خاص پر مبنی ہوگا نہ من حیث الحقیقۃ اور حمل بر مجاز اسی وقت صحیح ہوتا ہے جبکہ کلام میں قرینہ صارفہ عن الحقیقۃ موجود ہو۔ ورنہ اصل حقیقت ہے اور تبادر ذہنی بطرف حقیقت اولیہ فطری طبعی ہے۔ کلام پاک میں نزول روح اور نزول ملائکۃ کا ذکر متعدد مقام پر موجود ہے۔ آیات۔ (الف) تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر۔ بعض آیات میں صرف نزول ملائکۃ کا ذکر آیا ہے اور بعض میں روح اور ملائکۃ دونوں کا اور احادیث اہل بیتؑ وغیرھم اس پر بالصراحۃ دال ہیں کہ روح اور ملک دو نوع ہیں نیز امامؑ نے یہ بھی تشریح فرمادی ہے کہ اوحینا الیک روحا من امرنا میں۔

روح سے مراد جبرئیل ہرگز نہیں ہے اور امامؑ کا یہ فرمانا۔ ھی من الملکوت (یعنی روح ملکوت سے ہے) اشارہ ہے اختلاف نوعیت ملک و روح کی طرف اور مطلب آپؑ کا یہ ہے کہ جبرئیل ملائکۃ سے ہے اور روح ملکوت سے ہے اور ملکوت باطن شی اور مابہ الوجود (مابہ القوام۔ مابہ القیام) کو کہتے ہیں۔ یعنی جس کے سبب سے وجود باقی و قائم ہو۔ وبیدہ ملکوت کل شی۔ ملک اس جسم نورانی کو کہتے ہیں جس میں ملکیت بہ نسبت اپنے تحت انواع کے زیادہ ہو اور روح ملکوت ہی سے ہے۔ یعنی اصل اس کی (روح) کی ملکوت ہے اور ملکوت (عین قدرت و مابہ الحیاۃ ہے) نہ کہ جسم یا جسمانی۔ بخلاف ملائکۃ اور اس وجہ سے وہ ملک سے بدرجہا افضل

ہے۔ پس کسی صورت سے ملک کو روح نہیں کہہ سکتے۔ اگر روح سے عام طور سے یا اوحینا الیک روحا من امرنا یا ایدھم بروح منه. یا کلمة القاھا الی مریم و روح منه. یا نفخت فیه من روحی۔ میں روح سے جبرئیل یا کوئی اور فرشتہ مراد لیا جائے تو صریح آیات قرآن کا انکار اور احادیث معدن العلوم کی تکذیب لازم آتی ہے اور کوئی مسلمان اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ ایک فلسفی یا ایک لغوی کے کہنے پر خدا اور رسولؐ کی (معاذ اللہ) تکذیب کرے اور تسلیم کرے کہ روح سے مراد جبرئیل ہے یا یہ کہ روح سے مراد قرآن ہے۔ مسلمان کیا بلکہ کوئی عاقل بھی اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ کیونکہ یقیناً کتب نعت بعد نزول قرآن مدون ہوئی ہیں اور زبانِ عربی کم سے کم زمانہ حضرت اسماعیلؑ سے بولی جاتی ہے کسی فصیح کے کلام سے اس کی سند نہیں مل سکتی کہ وہ لوگ لفظ روح کو قرآن کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ کیا ان کو علم نہ تھا کہ قرآن کوئی کتاب ہے اور وہ ایک پیغمبر پر نازل ہوگی؟ وجہ صرف یہ ہے کہ جب اہل لغت نے اس آیت کو دیکھا اور مطلب نہ سمجھے تو لکھ دیا کہ روح سے مراد قرآن ہے اور قرآن خدا نے اپنے پیغمبر کو وحی کیا ہے۔ ایسی صورت میں روح سے فرشتہ مراد لینا بھی عین نادانی ہے۔ یقیناً روح اور شی ہے فرشتہ شی دیگر۔ روح روح ہے فرشتہ فرشتہ ہے۔ (بلکہ طعن ہر کلام الٰہی۔ کیونکہ اس صورت میں اوحینا الیک جبرئیل ہو گا اور نسبت ایجاء طرف جبرئیل یا غیر جبرئیل تکلفات کثیرہ کی محتاج ہے۔)

جواب: پانچویں روح یعنی روح قدس سب انبیاء و آئمہ طاہرین میں ہوتی ہے اور یہ روح امری ختمی، روح القدس کلی، مخصوص ہے آنحضرتؐ اور آئمہ طاہرین آئمہ اہل بیتؑ سے اور اس لئے ایک زمانے میں دو معصوموں کا موجود ہونا منافی نہیں

ہے کیونکہ دراصل اس زمانے میں بھی اُسی روح اعظم کی شعاعیں وجود امامؑ میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور بعد آنحضرتؐ ایک تعلق خاص امامؑ زمانہ سے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس وقت امام عصر اور ولی زمان اور حجۃ ظاہر و باطن وہ ہوتا ہے۔ زمانہ معصوم سابق میں معصوم لاحق صامت ہوتا ہے اور وہ ناطق چنانچہ جناب سرکار دو عالمؐ و جناب ولایت مآب یعنی علی علیہ السلام۔ پس آنحضرتؐ ناطق تھے اور جناب امیرؑ صامت اور بعد انتقال ظاہری آنجنابؐ تعلق خاص جناب امیرؑ سے ہوا اور وہی حجت ناطق و ظاہر قرار پائے اور حضرتؑ کے زمانے میں حسنین علیہم السلام صامت تھے۔ (وعلی هذا القیاس)

اسی وجہ سے کہ اس روح اعظم کا تعلق ان سے بھی ہے ان کو نفس رسول کہا گیا ہے اور اسی وجہ سے عالم صفر سنی میں جناب امام حسینؑ کی بات حضرتؐ نے فرمایا۔ **دعوہ فانه علمه علمی وعلمی علمهٗ**۔ امام حسینؑ کا علم میرا علم ہے اور میرا علم امام حسینؑ کا علم ہے اور جناب امام حسنؑ کو اپنے ساتھ شریک فرما کر فرمایا **ان الصدقة علینا حرام** صدقہ ہم تمام پر حرام ہے۔ صدقہ ہم تمام پر حرام ہے۔ جس کی نسبت (شارح بخاری) جواب شبہ میں فرماتے ہیں کہ امام حسنؑ کے حال کو اپنے اوپر قیاس نہ کرنا چاہتے۔ **فانه یُلاحظ لوح المحفوظ فی تلک الحال**۔ یعنی وہ اس صفر سنی میں روح محفوظ کا ملاحظہ و مطالعہ کرتے تھے۔ یعنی بلاواسطہ غیر عرشِ الٰہی و خزانہ علم خداوندی سے ان کو تعلق تھا جیسا کہ جناب رسولؐ کو پس ظہور روح خاص نبوی در وجود آئمہ طاہرین بطور انتقال نہیں ہے کہ ایک سے منتقل ہو کر دوسرے میں آجاتی ہے اور دوسرا اس سے خالی ہو جاتا ہے مثلاً آنحضرتؐ سے منتقل ہو کر جناب امیرؑ میں آئی تو آنحضرتؐ سے جدا ہو گئی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہی روح تو اصل نبی ہے اور اس کا

کمال یعنی مرتبہ ختم نبوت بحال خود باقی۔ صرف جسم ظاہری عنصری کا انتقال اس عالم سے اس عالم کی طرف ہوتا ہے اور روح امری اپنے مرکز پر قائم باقی ہے۔

ہاں امام سے بحیثیت تصرف مطلق وولایت مطلقہ تعلق خاص ہو جاتا ہے۔

تفصیل

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلم ومحقق ہے کہ نبی وامام میں دو جز ہوتی ہیں ایک روح دوسرا جسم یا بدن۔ روح حقیقت نورانیہ علمیہ ہے اور جسم بھی نورانی اور دونوں متصل ہو کر نُورٌ عَلٰی نُورٌ نور علی نور ہو جاتا ہیں۔ کیونکہ ظرف مطابق مظروف اور محل مناسب حال اور مکان لائق مکین چاہئے۔ روح اعظم نورانی علمی کے واسطے محل و مظروف بھی نورانی ہی چاہئے۔ قدجاء کم من اللہ نور و کتاب مبین۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ان دونوں نوروں میں سے مادۂ نورانیہ نبیؐ وامامؑ صلب در صلب انبیاء واوصیاء سے منتقل ہو کر آتا ہے جب ایک صلب سے منتقل ہو کر دوسرے میں جاتا ہے تو یہ نور اس سے جدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اوّل یہ مادہ نورانیہ نبویہ پیشانی حضرت آدم علیہ السلام میں جلوہ گر ہوا بعد ازاں پشت در پشت منتقل ہو کر حضرت ہاشمؑ میں نمودار ہوا اور آپ سے آگے دو جز ہو کر ایک حصہ صلب حضرت عبداللہ علیہ السلام اور دوسرا صلب جناب ابوطالب علیہ السلام میں منتقل ہوا۔ پس جناب ہاشمؑ سے جب یہ نور منتقل ہوا تو پھر آپ میں نہ رہا اور وہ نورانیت آپ سے جدا ہو گئی۔ جناب عبداللہؑ وابوطالبؑ میں جلوہ گر و درخشاں ہوئی اور ان بزرگواروں سے جدا ہو کر اس عالم جسمانی میں رونق افروز اور جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا دختر رسولؐ خدا اور جناب امیر علیہ السلام سے پھر اس نورانیت کا اجتماع ہوا جناب حسنین علیہما السلام اور جناب امام حسن علیہ السلام کی

دختر اور جناب امام حسین علیہ السلام کے فرزند جناب امام علی زین العابدین علیہ السلام سے حضرت باقر علیہ السلام میں اجتماع ہوا۔ پھر اسی طرح منتقل ہوتا ہوا حضرت مہدی آخر الزمان علیہ السلام عجل اللہ فرجہ تک پہنچا اور وہاں پر اس اظہار تام و بروزِ کامل بلکہ کمالات روحانی بھی ظہور تام و بروزِ کامل حضرتؑ ہی کے وجود سے وابستہ ہے۔ جب وہ وقت آئے گا تو ظہور اس کا اس درجہ ہوگا کہ آفتاب و ماہتاب کی روشنی ماند پڑ جائے گی۔

واشرقت الارض بنور ربھا۔ لیکن اس (روح اعظم۔ روح امری) روح مسدد اور حقیقت نورانیہ علمیہ (جو مدار دملاک ختم نبوت و ولایت و امامت و خلافت مطلقہ ہے) کا تعلق بطور انتقال نہیں ہے وہ صُلباً عَنْ صُلبٍ نہیں آتی۔ بلکہ بطور تشعشع (شعاع) ہے کہ بلا واسطہ غیر اس کا مبدا فیاض سے افادہ و افاضہ ہوتا ہے۔ اسی مخلوق اول و مصنوع اول و اول ماصدر کا مرکز وجود نورانی محمدیؐ ہے یہ اپنے مرکز پر باقی رہتی ہے اور بطور تشعشع و ظہور شعاعی۔ وجود آئمہ طاہرینؑ سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔

یہ نور ایک ہی ہے اور اس کا مرکز وجود محمدیؐ۔ ہاں ظہور اس کا کبھی وجود علوی سے ہوگا اور کبھی وجود حسنیؑ سے اور کبھی وجود حسینیؑ سے۔ اور ظہور تام اور کامل وجود مہدی علیہ السلام سے ہوگا۔ بالفاظ دیگر وجود حضرتؑ شہر ہے اور آئمہ اثنا عشر علیہ السلام ابواب شہر۔ انا مدینة العلم وعلی بمابھا۔ لہٰذا ایک وقت اس کا ظہور باب علویؑ سے ہوگا اور ایک وقت باب حسنیؑ سے۔ (وقس علی ذالک)

اسی واسطے ان حضرتؑ نے فرمایا اولنا محمدؐ واوسطنا محمدؐ و آخرنا محمدؐ و کلنا محمدؐ۔ ہمارا پہلا بھی محمدؐ ہے اوسط و آخر بھی محمدؐ اور ہم سب

کے سب محمدؐ ہیں۔ فارواحهم ونورهم وطينتهم واحدة طابت وطهرت بعضها من بعض۔ کل کے کل نور واحد و نفس واحد ہیں۔ لیکن آئمہ طاہرینؑ کا نبی نہ ہونا۔ اس کا جواب قرآن میں موجود کہ نبیین ختم ہیں اور حضرتؐ پیغمبر آخر الزمان ﷺ نص قرآن خاتم النبیین ہیں اور فوق ختم نبوت کوئی درجہ نہیں۔ اس لئے ترقی بنوات طولا مسدود ہے۔ البتہ ترقی عرضی ہے۔ یعنی بلحاظ ظہور مراتب ختم نبوت وجود آئمہؑ میں۔

اگر بعد آنحضرتؐ نبوت ہوتی تو ضرور یہ سب کے سب انبیاء ہوتے۔

اگر جہاں میں نبی بعد مصطفیٰؐ ہوتے
امام بارہ کے بارہ سب انبیاء ہوتے

مثال ان کی حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی سی ہے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ شریک نبوت ہیں اور دونوں مبعوث و مرسل بطرف بنی اسرائیل۔ اذهبا الى فرعون فانه طغى فقولا له قولا لينا لعله يتذكر اويخشى۔

لیکن یہاں (آئمہ طاہرینؑ) نبوت نہیں اس لئے نبی و مرسل نہیں کہلا سکتے۔ كما قالؐ يا عليؑ انت منى بمنزلة هارون من موسىٰ الا انه لا نبى بعدى۔

لیکن ما بہ النبوۃ علم ہے۔ پس اس میں وہ (آئمہ طاہرینؑ) شریک پیغمبرؐ ہیں۔ جیسا کہ احادیث و آیات سے ثابت ہے کہ وہی حقیقت نورانیہ علمیہ ان میں ہے جو پیغمبرؐ میں ہے اور وہ اصل علم و عین علم ہے۔ احادیث کثیرہ میں تصریح ہے کہ علیؑ بھی شریک علم نبویؐ ہیں۔ لیکن نبی نہیں ہیں۔ جیسا کہ حدیث ایوب بن الحسر میں ہے۔ حضرت صادقؑ نے فرمایا کہ اللہ نے نبیین کو تمہارے نبی پر ختم کر دیا۔ پس آپؐ کے بعد

کوئی نبی نہیں ہے اور کتب کو تمہاری کتاب پر ختم کر دیا پس اللہ کے بعد کوئی کتاب آسمانی نہیں ہے اور اس کتاب میں ہر شی کا بیان موجود ہے۔ ابن علاء کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ **انما الوقوف علینا فی الحلال و الحرام فاما النبوۃ فلا**۔ یعنی جملہ احکام حلال و حرام کو تو ہم ہی سے پوچھئے لیکن نبوت پس وہ ہمارے لئے نہیں ہے۔

حجران ابن اعین سے روایت ہے کہ حضرت صادقؑ نے فرمایا کہ جبرئیل امین نے آنحضرتؐ کو دو انار لا کر دیئے۔ ایک آپؐ نے کھالیا اور دوسرے کے دو ٹکڑے کئے اور خود تناول فرمایا اور دوسرا علیؑ کو دیا اور وہ علیؑ نے کھایا۔ پھر آپؐ نے فرمایا اے بھائی کیا تم جانتے ہو یہ کیسے انار تھے اور ان کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا پہلا انار تو نبوت تھی اس میں تو تم شریک نہیں ہو اور دوسرا انار علم تھا پس اس میں تم میرے شریک ہو۔ راوی نے دریافت کیا کہ کس طرح سے علیؑ شریک علم نبیؐ ہو گئے؟ فرمایا جو کچھ اللہ کی طرف سے انہیں ملا وہی علیؑ کو پہنچا دیا۔ اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں۔ حضرت علیؑ اور ان کی اولاد معصومینؑ تمام صفات میں مثل پیغمبرؐ ہیں۔ مگر اسم نبی اور اباحۃ نساء۔ حدیث مصروف **انا مدینۃ العلم و علی بابھا**۔ اس پر دال ہے کہ شریک علم نبوی ہیں۔ کیونکہ در داخل شہر اور جزو شہر ہوتا ہے اور پھر ظہور و بروز موقوف ہے دروازے ہی پر۔ تمام علوم نبوی کا ظہور انواب علوم ہی سے ہوا ہے۔ آپ شہر علم اور تمام علوم پر حاوی ہیں اور امامؑ کی شان میں آیا ہے۔ **و کل شی احصیناہ فی امام مبین** ۝ ہر ایک کی تفصیل وار وجود امامؑ میں موجود ہے۔ پس اور پیغمبرؐ یہی حضراتؑ صاحب خلافت مطلقہ و ولایت مطلقہ و امامت مطلقہ و معدن علم ہیں۔ لیکن شرف تقدم آنحضرتؐ کو ہے۔

کہ آپؐ اصل ہیں اور یہ آپؐ کی شاخیں دو آیۃ مجیدہ۔ وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً وغیرھا سے ظاہر ہے اور خود جناب امیرؑ فرماتے ہیں۔ انا عبد من عبید محمدؐ اس لئے آئمہ طاہرینؑ کو آنحضرتؐ سے افضل جاننا کسی طرح درست نہیں۔

(واقعہ 145 کشف)

☆☆☆☆☆

# درس ہشتم

ان اللہ هو الذات الواجب المستعجمع لجميع الصفات لكمالية۔ جمیع صفات و اوصاف کمالیہ کی جامع و حاوی بالذات وہی ذاتِ واجب الوجود ہے جس کو ہم سب اللہ کہہ کر پکارتے ہیں والكمال حقيقة ما يوصف به الله تعالى وما لا يوصف به ذاته فهو ليس بكمال اور حقیقتاً کمال ہی وہی ہے جس سے ذاتِ خداوندی متصف وموصوف ہو سکے اور جو چیز اور صفت اس کی ذات کی صفت نہ ہو سکے وہ کمال نہیں بلکہ نقص ہے اور اصول کمالات چار ہیں۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ والعالم. اى كل ماسوى الله فهو ممكن فى ذاته۔ جو کچھ ماسوی اللہ ہے وہ عالم کہلاتا ہے اور عالم کل کا کل ممکن بالذات ہے اور ممكن من حيث هو ممكن۔ مقام ذات میں کسی صفت سے متصف نہیں۔ حتی خود اپنے وجود سے بھی عاری ہے اور اس لئے اپنے وجود اور جملہ کمالات وجود حیات علم قدرت ارادۃ وغیرھا من محتاج کامل مطلق واجب الوجود بالذات ہے۔

اور وجود ممکن میں وہی شی پائی جا سکتی ہے جو اس مبدا فیاض سے اس کو پہنچی ہے خواہ حیات ہو یا علم ہو یا قدرت وارادہ وغیر ذالک۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ

لا علم لنا الا ما علمتنا۔ ہر ایک ممکن کی شان اس اجمال کی تفصیل ہے۔ پس ہر ایک شی علم میں محتاج اسی علیم بالذات کی ہے۔ جس طرح کہ اور اوصاف کمالیہ ہیں اور بغیر تعلیم علیم بالذات کسی ممکن کو علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

تعلیم اللہ العباد علی قسمین. احدھما تعلیم بالآلات والادوات الظاھریۃ الجسمانیۃ. والاسباب المرتبۃ المستجددۃ کما فی العلوم الاکتسابتہ المروجۃ۔ ایک تعلیم تو بذریعہ آلات و ادواتِ بدنیہ ظاہریہ اور اسباب مرتبہ متجددہ ہے جیسا کہ علوم کسبیہ اکتسابیہ میں روزانہ مشاہدہ ہوتا ہے اور یہ تعلیم اگرچہ اصطلاحاً تعلیم الٰہی نہیں کہلاتی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آخر میں اسی ذاتِ علیم وحکیم پر منتہی ہوتی ہے اور فوق کل ذی علم علیم کا سلسلہ علل ومعلولات اسی مسبب الاسباب وعلۃ العلل پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی عاقل وبصیر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مشاہدہ اس کا موید ہے۔

دوسری قسم کی تعلیم وہی ہے جس میں اسباب ظاہریہ وآلات وادواتِ بدنیہ وقویٰ وحواس جسمانیہ کو مدخلیت نہیں خواہ تعلیم مطلقاً بلاواسطہ غیر ہو یا بواسطہ بعض اسباب باطنیہ وتوسط روحانیات۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس میں صورت مکمل وہی ہے اور سب سے افضل وہی ہے جس میں اُس معلم حقیقی اور متعلم کے درمیان کوئی اور واسطہ نہ ہو۔

ولذا قال المحققون الطریق الثانی التعلیم الربانی. وذالک علی وجھین. الاول القاء الوحی. (بلاواسطہ) فقالوا علم الانبیاء اشرف رتبۃ من جمیع علوم الخلائق لحصولہ من اللہ تعالی بلاواسطۃ

وسیلة و بیان هذه الکلمة فی قصة آدمؑ و ملائکة۔ اور دوسرا طریق تعلیم ربانی ہے اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ جن میں اول صورت القاء وحی (بلاواسطہ) ہے۔ پس علم انبیاء چونکہ اسی طریق سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جملہ خلائق کے جمیع علوم سے اشرف ہے۔ کیونکہ وہ بلاواسطہ و وسیلہ غیر حاصل ہوتا ہے اور اس جملہ کی تفصیل قصہ آدم و ملائکہ میں موجود ہے۔ علم ادمؑ الاسماء کلها۔ وہ تعلیم بلاواسطہ و وسیلہ غیر ہے۔ جس کے تمام ملائکہ پر آپ کو فضیلت حاصل ہوئی اور ملائکہ کو ان کے مقابلے میں خدا سے یہ عذر کرنا پڑا۔ لاعلم لنا الا ما علمتنا پس وحی وہ تعلیم ربانی ہے۔ بطور سر و بطریق باطنی روحانی و بطور رمز و اشارہ۔

اور یہ تعلیم اسی واسطے تعلیم آنی ہے اور وہی مقام کن فیکون ہے ادھر ارادۂ علیم کسی کی تعلیم سے متعلق ہوا تو اس کو علم حاصل ہو گیا۔ جتنا بھی حسب مصلحت و مشیت اس کو منظور و مطلوب ہوا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تعلیم استعداد و قابلیت متعلم پر بھی موقوف ہے اور چونکہ موجودات استعدادِ تعلم میں مختلف ہیں یہ تعلیم بھی مختلف ہے۔ جس میں استعداد و اشد و اقوی ہوگی اس میں تلقی کلام الٰہی اور تعلیم زیادہ ہوگی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ذات واجب الوجود کے علم مطلق و علیم بالذات ہونے کی علت و دلیل اس کا تجرد ہے۔ کما قال رئیس المحققین. الاحکام والتجرد واستناد کل شیء الیه دلائل العلم۔ یعنی ممکنات و مکوناتِ عالم کا احکام و استحکام نظم و نسق کی تکمیل اور اس کا مجرد ہونا اور ہر شی کا بلحاظ اپنے امکانِ ذاتی کے اس کی طرف منسوب ہونا یہ اس ذات واجب الوجود کے عالم ہونے کی دلیلیں ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ برہان (دلیل) کو شامل یہی دلیل تجرد ہے **واللہ مجرد وکل مجرد عالم بذاتہ وبغیرہ**۔ اللہ تعالیٰ مجرد ہے جسم وجسمانیات سے بالکلیہ منزہ ہے اور ہر ایک مجرد اپنی ذات وغیر ذات سب کا عالم ہوتا ہے۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہے کہ ذاتِ مجرد وبسیط کی تمام صفات عین ذات ہوتی ہیں اور اسی پر قدم اور وجوبِ وجود دال ہیں۔ پس ذات خداوندی عین حیات عین علم۔ عین قدرت وغیرہا ہے۔

پس ذات مجرد عین علم ہے اور علم لازمِ تجرد ہے اور کل معلوم اور مخلوق وموجود اسی کی طرف منسوب ومستند پس یہ صفت کمال کی ممکن کے لئے ممکن نہیں۔ مگر اس ذات واجب الوجود سے اتصال پیدا ہونے سے اور اس کی طرف مستند ہونے سے اور قرب و اتصال اس ذاتِ مجرد سے ممکن نہیں ہے مگر بذریعہ تجرد۔ پس جس میں جس قدر تجرد زیادہ ہوگا اسی قدر اس کو اس ذاتِ مجرد وبسیط سے جو علیم بالذات ہے اتصال وقرب زیادہ ہوگا اور جس میں جتنی جسمانیت ومادیت زیادہ ہوگی اسی قدر اس کو اس ذات سے بعد (دوری) ہوتی جائے گی اور مکلفین جس قدر تجرد میں بڑھیں گے اسی قدر قرب واتصال میں ترقی کریں گے۔

اور جتنا تجرد اور اتصال وقرب ذاتِ مجرد علیم وحکیم سے بڑھے گا اسی قدر اس کا علم زیادہ ہوگا اور شعاعِ نور ازلی اس پر زیادہ پڑے گی اور یہ ذات روشن تر ہوتی جائے گی۔ **فلیس العلم الاستضاء من نورالواجب الوجود والذات المجرد**۔ علم نہیں ہے مگر اس ذاتِ واجب الوجود ومجرد کے نور سے روشنی حاصل کرنا ہے۔ **واللہ نورالسموات والارض**۔ الخ

یاد رہے کہ عالم تین ہیں۔

1- عالم سرمدی۔

2- عالم دھری۔

3- عالم زمانی۔

## 1-عالم سرمدی

اول عالم سرمدی ہے جو اس ذات سرمدی کی طرف منسوب ہے اور فوق جمیع عالم ہے اور جس کو عالم ملکوتی روحانی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

## 2-عالم دھری

جو عالم جسمانی سے فوق اور عالم روحانی سرمدی کے تحت ہے اور اس میں فی الجملہ روحانیت اور فی الجملہ جسمانیت پائی جاتی ہے۔ اسی لئے اس کو عالم نفسانی و عالم برزخی کہتے ہیں اور اس کے تین درجے ہیں۔ یعنی اس کا افق اول عالم ارواح ہے اور اس کا افق آخر عالم مواد بسیطہ اور وسط عالم نفوس۔

## 3-عالم زمانی

جس کو عالم ترکیب و عالم اجسام کہتے ہیں۔ جب عند الحکماء محقق مبرین ہے کہ عالم روحانی و نفسانی و جسمانی تین عالم ہیں۔ تو بعض حکماء کا نفس و روح کو ایک شی قرار دینا بے حجت و دلیل ہے اور عالم انسانی جامع ہے۔ عوالم ثلاثہ کو یعنی روحانی، نفسانی، جسمانی علیؑ نے فرمایا۔ **اتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی**

العالم الاکبر۔ انسان اشرف مکونات وافضل ممکنات ہے اور اس وجہ سے کہ یہ عوالم مختلفہ متضادہ متبائینہ کو جامع اور حاوی ہے۔ خلافت الٰہیہ کے قابل ٹھہرا۔

(1) فقال انی خالق بشرا من هنين فاذا سوتيه ونفخت فيه من روحی فقوا له ساجدين.

(2) وقال انی جاعل فی الارض خليفه۔

روح بہ نسبت عوالم ماتحت مجرد ہے اور نفس میں دو جہتیں یعنی ایک جہت اس میں روحانی ہے۔ جس سے وہ افق روحانی سے متصل ہے اور ایک جہت اس میں مادی ہے جس سے عالم ترکیب و عالم جسمانی سے متصل ہے۔ جیسا کہ تمام ممکناتِ ارضیہ و سماویہ میں یہی ترکیب وترتیب ہے۔

روح متصل ہے عالم ملکوت اعلیٰ وضع الٰہی سے۔ لیکن اس عالم ترکیب و جسمانی میں وہ متعلق ہے نفس سے اور نفس متعلق ہے بدن سے۔ پس کمالِ انسانی موقوف ہے نفس کو مادیت وجسمانیت سے مجرد و منسلخ کرنے پر۔ جس قدر نفس انسانی مادیت وجسمانیت سے مزکی ہوتا جائے گا اسی قدر یہ عالم روحانی میں بڑھتا جائے گا۔ جس قدر ظلمت اور تاریکی مادہ سے دور ہوتی جائے گی اس قدر نورانیت روحانی اس کی زیادہ ہوگی اور اسی پر انسان ترقی اور اس کی فلاح و صلاح موقوف ہے۔ فقال عزوجل. قد افلح من زكها وقدخاب من دسها۔ فلاح اسی کے لئے ہے جس نے نفس کو مزکی بنالیا اور چونکہ روح نفس سے متعلق ہے جس قدر نفس مادے سے مجرد ہوتا جائے گا اور عالم روحانی کی طرف بڑھے گا۔ روح اپنے عالم کی طرف رجوع کرے گی اور عالم ملکوت اعلیٰ سے اتصال میں بڑھے گی اور چونکہ عالم ملکوت عالم تجرد

ہے اور تجرد علم ہے۔ روح اس عالم سے علم کو دن بدن ساعت بساعت حاصل کرے گی۔ کلام نفسانی کو سنے گی۔ خطاب الٰہی کو سمجھے گی اور معارف کی تلقی کرے گی اور یہی اصل الہام ووحی کی اجمالی صورت ہے۔

اب اس تحقیق کے بعد صاف وواضح معلوم ہوا کہ الہام ووحی خصائص نبوت منافی امامت نہیں۔ کیونکہ آئمہ نفوس زکیہ کو بھی اتصال عالم روحانی اور روح کو قرب عالم ملکوت اعلیٰ وعالم نورانی ممکن ہے جس طرح کہ نفس نبیؐ کو ممکن ہے اور اس میں کوئی استحالہ عقلی نہیں ہے نہ صرف حاصل ہے بلکہ ہر ایک نفس زکیہ کو حاصل ہو سکتا ہے۔ خصوصاً وہ امامؑ جو درجہ ولایت مطلقہ پر بھی فائز ہو ہر وقت مقام قرب واتصال پر ہے۔ کیونکہ مقام ولایت مقام تصرف ہے۔ واللہ ھو الولی۔

ظاہر ہے کہ عالم ماتحت عالم مافوق پر تصرف نہیں کر سکتا۔ بلکہ بالعکس ہے کہ مافوق ماتحت پر متصرف ہوتا ہے۔ عالم جسمانی عالم نفسانی پر مؤثر ومتصرف نہیں اور عالم نفسانی عالم روحانی پر مؤثر ومتصرف نہیں ہو سکتا۔ ہاں عالم روحانی جملہ عوالم نفسانی و جسمانی پر موثر ومحیط اور متصرف ہے۔ پس ولی متصرف ولی متصرف نہیں ہو سکتا جب تک اس کو اتصال عالم ملکوت اعلیٰ سے نہ ہو۔

پس ولی کو اتصال عالم ملکوت اعلیٰ ضروری ہے اور اتصال عالم ملکوت اعلیٰ کو تلقی وحی والہام وسماع کلام باطنی روحانی وخطاب الٰہی ممکن ولازمی ہے۔

**فان اتصاله دال على تجرده والتجرد دال على العلم وحصول هذا الاتصال والقرب من المجرد الحق هو العلم اللدنى۔**

اس کا اتصال اس کی تجرد کی دلیل ہے اور تجرد دال ہے علم پر اور یہ اتصال اور قرب مجرد

حق ہی علم لدنی ہے۔

کا قال. علمناہ من لدنا علما. وانک لتلقی القرآن من لدن علیم حکیمo (سورہ نحل)

فقال الحکماء. وقد ثبت فی الحکمة المتعالیة ان العلم والتجرد متلا زمان فکلما تزدا دالنفس علما تزداد تجردا وکلما تزداد تجرداً تزداد علما۔

ولا ریب ان التجرد اشرف الکمالات المتصورة للانسان اذبه یحصل التشبه بالملاء العلی واهل القرب من الله وبه یحصل القرب من الله ای الوجود الحق المجرد۔ یعنی حکماء کہتے ہیں کہ حکمت متعالیہ وعلوم مافوق الطبعیۃ الٰہیہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ علم اور تجرد آپس میں متلازم (لازم وملزوم) ہیں۔ پس جس قدر کسی نفس میں علم بڑھتا ہے اسی قدر اس میں تجرد بڑھتا ہے اور جس قدر تجرد بڑھتا ہے اسی قدر علم بڑھتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تجرد ان تمام کمالات سے اشرف ہے جو انسان کے لئے تصور میں آسکتے ہیں اور ممکن ہیں۔

کیونکہ اسی تجرد کے ذریعہ انسان ملاء اعلیٰ اور ملائکہ سے مشابہت پیدا کرتا ہے اور اسی تجرد سے مقربین بارگاہ قدس خداوندی میں داخل ہوتا ہے۔ بلکہ اسی تجرد سے انسان کو اس خدا سے قرب حاصل ہوتا ہے جو وجود حق مجرد ہے۔ یعنی اسی تجرد سے انسان بہترین کمالات الٰہی تک متصف ہوتا ہے۔

یہی تجرد ولایت ہے (ولایت کی کئی اقسام ہیں) اور نہیں ہے ولایت مگر تصرف اور تصرف نہیں حاصل ہوتا مگر علم سے اور علم حقیقی نورانی نہیں حاصل ہوتا ہے مگر مبدأ فیاض

سے۔ بلکہ نفس علم تملک وتصرف ہے اور نہیں ہیں معنی ولایت مگر یہی تصرف علمی۔

مسلم ہے کہ احتیاج نقص ہے اور غنا کمال ہر ایک شی محتاج ناقص ہے جس میں اور جتنی احتیاج زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ شی ناقص کہلائے گی۔ اور اسی واسطے کامل مطلق اور کامل حقیقی محض ذات واجب الوجود ہے کہ ہر قسم کی احتیاج سے مبرا ومنزہ ہے اور ہر ایک شی اس کی محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔ بعد ازاں جو چیز کامل کہلائے گی وہ بہ نسبت دوسری مخلوق کے کامل کہلائے گی نہ فی حد ذاتہ اور وہ کامل وہی ہے جو اقرب الی المبدأ الکامل ہو۔ پس ضروری ہے کہ اول مخلوق ومصنوع اول کامل ہو اور وہ سوائے مبدأ فیاض اور کسی شی کا محتاج نہ ہو۔

☆ بنابریں کوئی جسم اول مخلوق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ محتاج ہے مادہ اور صورت کا۔

☆ کوئی مرکب مخلوق اول نہیں ہوسکتا کہ وہ محتاج ہے اپنے اجزاء کا۔

☆ کوئی مادہ مصنوع اولی نہیں کہلا سکتا کیونکہ وہ اپنے وجود میں صورت کا محتاج ہے۔

☆ اسی طرح سے صورت محتاج مادہ ہے پس وہ بھی مصنوع اولی نہیں کہلا سکتی۔

عرض مخلوق اول نہیں ہوسکتی کہ وہ محتاج ہے جوہر کی۔ وقس علی ذالک۔ اس سے واضح ہوگیا کہ ہوا اصل مخلوق اول نہیں ہے اور نہ پانی مصنوع اول ہے۔ مخلوق ومصنوع اول چاہئے کہ ایک جوھر مجرد عن المادہ کہ ان تمام مکونات ومصنوعات میں وہی اقرب المبدأ اور کامل مصنوع ومخلوق ہوسکتا ہے اور جوہر مجرد نہیں ہے مگر عقل۔ کیونکہ تعریف عقل یہی کی گئی ہے کہ العقل جوھر مجرد فی ذاتہ وافعالہ۔ عقل ایک جوہر ہے جو اپنی ذات اور اپنے افعال میں مجرد ہے اور کسی امر میں محتاج مادہ نہیں ہے۔

پس مخلوق و مصنوع اول عقل ہے۔

ایضاً: عدم ظلمت ہے اور وجود نور۔ ظلمانیت نقص ہے اور نورانیت کمال پس نہ ہو گا صادر اول مگر نور مجرد بالنسبة الی المادیات والمخلوقات والمصنوعات المغائیرة عن نفسه والنور هوالظاهر بذاته والمظهر لغیره۔ نور خود ظاہر اور روشن ہوا ہے اور دوسرے کو ظاہر اور روشن کر دینے والا۔ اس لئے اول مخلوق عقل نورانی ہے۔ اس واسطے معاونِ علومؑ نے فرمایا ہے کہ اول مخلوق عقل ہے۔ اول ماخلق الله العقل۔

مبدأ فیاض واجب الوجود علیم بالذات حکیم بالذات سمیع بالذات بصیر بالذات۔ قدیر بالذات اور حی بالذات ہے اور کامل ہمیشہ کمال کو پسند کرتا ہے اور کمال ہی کو چاہتا ہے۔ اور جہل نقص ہے سفاہت (بے وقوفی) نقص ہے۔ عدم سماعت و بصارت نقص ہے۔ عدم قدرت وحیات نقص ہے۔ ذاتِ کامل کبھی جاہل، سفیہ، اپاہج و عدیم الحیات وجود کو پسند نہ کرے گی۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ مخلوق و مصنوع اول صاحب علم وحکمت وسماعت و بصارت اور صاحب قدرت وحیات صاحب حسن وادراک و شعور ہو اور سوائے مبدأ فیاض کسی کا محتاج نہ ہو اور ان صفات سے متصف ہونا صادر اول کیلئے اس حیثیت سے بھی ضروری ہے اور کبھی ان سے خالی نہیں ہو سکتا کہ وہ مبدأ فیاض سے بلا واسطہ وغیر صادر ہوا ہے اور کوئی اس کے اور اس ذات کامل کے درمیان جو حی، قیوم، علیم وحکیم اور سمیع وبصیر ہے فاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ صادر اوّل ان اوصاف سے عاری ہو۔ اور بالفرض اگر صادر اوّل ان اوصاف سے عاری ہو۔ تو کوئی مخلوق بھی ان اوصاف سے متصف نہ ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قادر مختار فاعل بالاختیار وہ ارادہ اس پر قادر ہے کہ وجود اول ان اوصاف سے عاری و ناتحقق فرمائے لیکن کمال ذاتی کا اقتضاء اس کے خلاف ہے اور اس لئے بھی کہ وہ جواد و کریم و فیاض بالذات ہے اور اس میں بخل نہیں ہے۔ پس کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے انعام و اکرام اولی کو جو بالذات ہے ناقص رکھے۔

والعالم کلہ جودہ وخزائن جودہ ولا تنقص ولا تنفذ۔ تمام عالم اس کا جود و کرم ہے جو کبھی نہ ختم ہونے والا ہے نہ کم ہونے والا ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ اس کے جود و فیض و کرم ذاتی کے خلاف ہوگا۔ وتعالی عن ذالک علوا کبیرا۔ اور وہ چیز جو صاحب حیات و قدرت و علم و ارادہ و سماعت و بصارت ادراک و شعور ہو وہ نہیں ہے مگر روح اور یہ بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ صادر اول مجرد ہونا چاہیے اور مطلق روح مجرد محض نہیں ہے۔ بلکہ بعض اصناف ارواح فی الجملہ مادیت بھی رکھتی ہیں اور اسی سلسلہ میں روح نباتی و روح حیوانی بھی ہیں۔ لہٰذا یہ روح وہ روح ہوگی جو مجرد ہو اور تجرد میں اقرب الی المبداء ہو کہ مجرد حقیقی واقعی ہے اور وہ نہیں ہے مگر عقل و مجرد نورانی۔ پس یہ روح نہیں ہے مگر روح عقلانی نورانی اس لئے کہا گیا کہ اول مخلوق روح ہے اور مراد اس روح سے روح خاص نورانی ہے۔ نیز

یہ مسلم ہے کہ صادر اول واسطہ ہے بین الخالق والمخلوق اور ہر ایک فیض وجود اس کے واسطے اور وسیلے سے پہنچتا ہے۔ اس لئے یہ صادر اول حیات عالم امکان و روح عالم ایجاد ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ صادر اول ایک جوہر مجرد نورانی عقلانی ہے۔ چونکہ جوہر مجرد ہے۔ لہٰذا اس کو عقل کہنا درست ہوا۔ اور اس حیثیت سے کہ یہ الظاہر بذاتہ والمظہر لغیرہ ہے۔ اور اول وجود ہے اور وجود نور ہے اس

کونور کہنا بالکل صحیح ہے اور چونکہ ذی شعور وادراک وذی حیات صاحب قدرت وعلم و ارادہ اور حیاتِ عالم امکان ہے اس کوروح کہا گیا ہے۔ اوراس کے جوہر لطیف نورانی ہونے میں کسی صاحب عقل وفہم کوشبہ نہیں ہوسکتا اور یہاں سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اول ماخلق اللہ العقل. اول ما خلق اللہ نور. اوخلق اللہ الروح ہرایک صحیح ہے اور ایک ہی شی ہے نہ متعدد ہاں تعدد اسماء تعدد واصاف وجمعیت کمالات کی دلیل ہے۔ جس شی میں جتنے اوصافِ کاملہ زیادہ ہوں گے اس قدر اس کے نام زیادہ ہوں گے اور اسی واسطے کہ ذات وجودِ خالق عالم وعالمیان کامل مطلق وجامع جمیع صفات و کمالیہ ہے اور اس کے اسماء حسنہ مبارکہ بھی سب سے زیادہ ہیں۔ بل الاسماء الحسنی کلها للله۔ چونکہ یہ مخلوق اول ہی اول المسلمین واول العابدین واول المومنین ہیں اسی لئے یہی ہی اول المصنوعین ہی ہو سکتے ہیں اور اولاً اول المسلمین وصف رسول خاتم المرسلین ہے۔ لہٰذا آپ کا وجود نص قرآن اول المصنوعین ہے۔ اور اول ما خلق الله نوری واول ما خلق الله روحی میں بھی کوئی تنافی نہیں ہے کیونکہ روح محمدی نہیں ہے مگر نور کما قال الله تعالی. وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب والا الایمان ولکن جعلناه نورا۔ نور خود ظاہر اور دوسرے کے لئے مظہر ہوتا ہے۔

اور مجرد کے لئے حصولِ علم ممکن ہے اور حواجب وموانع وعوائق مفقود۔ پس روح مجرد نورانی کے لئے حصول علم ممکن بلکہ واقع۔ جب اس روح مجرد کو نور خلق فرمایا نہ محض روح۔ وہ نورانی عالم پیدا ہوگی نہ جاہل۔ لانه لا مانع هناک لحصول العلم۔ پس یہ روح مجرد نورانی ہے پس وہ عقل اور وہ نور جس کو اول مخلوق ومصنوع فرمایا

ہے وہ روح نورانی محمدی کی ہے اور ہر ایک شی اللہ تعالیٰ کے وسیلے واسطہ سے پیدا اور خلق ہوئی ہے اور عقل اول سے ہی روح نورانی ہی مراد ہونا امام کے اس فقرہ سے بھی واضح ہے۔ وھو اول ما خلق اللہ من الروحانین o بس یہ عقل عقل روحانی نورانی ہے۔

تجرد دلیل ہے عالم ہونے کی سرکارؐ سے بڑھ کر کوئی مخلوق عالم نہیں ہو سکتا اور جو کچھ مبدأ فیاض سے صادر ہوگا وہ اسی مخلوق اوّلی سے متعلق ہوگا۔ علم، مشیت، ارادہ سے گزر کر جب مقام قضا و قدر میں آئے گا اسی مخلوق اول و صادر الٰہی سے متعلق ہوگا اور تقدیر مقدم ہے قضا پر۔ پس کل علم تقدیری کا محل و مورد یہی صادر اول ہوگا۔ پس جو کچھ کہ اس مقام اول مبدأ فاض سے صادر ہوگا وہ اسی جود و واسطہ فیض پر صادر ہوگا۔ اس لئے سرکارؐ نے فرمایا انامدینة العلم میں ہی علم کا شہر ہوں پس نہیں ہے مگر یہی وجود اولی و صادر اولی۔

والعلم الصادر من اللہ مکتوب فی صدرہ و محفوظ من السھو والنسیان والخطاء والخلط ومن ان یطلع علیہ احد۔ علم تقدیری الٰہی اس کے (سرکارؐ) کے سینے میں منقوش و مکتوب ہے اور اسمیں سہو و نسیان غلطی و خطا اور اس بات سے محفوظ ہے کہ کوئی دوسرا اس پر مطلع ہو سکے۔ اولاً مبدأ فیاض ہر وقت ہر آن جو صادر ہوتا ہے وہ اس نور اولی پر (روح اولی) پر صادر ہوتا ہے اور اسی پر لکھا جاتا ہے۔ اسی میں جمع ہوتا ہے اور یہاں سے دوسروں کو پہنچتا ہے۔

یہ من حیث التاثر عن المبدا ہے۔ لیکن من حیث التاثیر ہر فیض اسی کے واسطے سے دوسروں کو پہنچتا ہے اور جو کچھ از علم و جود و آثار قدرت عالم امکان میں پہنچے اور صفحہ عالم امکان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو علم قلوب مقربین و عارفین پر

فیضان ہوتا ہے اور ان میں ارقام فرمایا ہے اور عالم وایجاد میں جو کچھ بحیثیت وجود و ایجاد لکھا گیا ہے وہ اسی سے اور اسی کے واسطے اور ذریعہ سے لکھا گیا ہے۔

پس یہی قلم الٰہی ہے جو اول اول مخلوق ہوا اور صفحاتِ عالم پر جاری ہوا۔ فمن حیث الثاثر بالعلم من المبدا الفیاض و آثار القدرة الکاملة الالهية لوح محفوظ۔ ومن حیث التاثیر فی عالم الامکان وجریانه علی صفحات الاکوان هو القلم الاعلی الالهی۔

اسی واسطے آپ کی تعریف میں وارد ہوا ہے۔ هوام الامکانِ بقابلية وابو الاکوان بفاعلية یعنی وہ وجودِ اقدس اعلیٰ بلحاظ اپنی قابلیت وتاثر وانفعال ام الامکان ہے اور بلحاظ تاثیر وفعلیت ابو الاکوان۔ اور اسی قلم سے اشارہ ہے یداللهیت کی طرف ان الذین یبایعونک انما یبایعون الله یدالله فوق ایدیهم۔ بے شک وہ لوگ جو اے ہمارے حبیب تجھ سے بیعت کرتے ہیں اور تیرے ہاتھ کے نیچے بیعت کے ہاتھ رکھتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں اور خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ پس یہی دست الٰہی اور یہی ذاتِ قلم قدرت الٰہی ہے اور یہی نور مادہ عالم امکان ہے اور یہی وہ سمندر ہے جس کے قطرات کو تمام عالم وجود سیراب اور سرسبز ہوئے اور اس کی اس فضیلت کے لحاظ سے یہ مواد عالم ایجاد و تخلیق ہے۔

قال. ن والقلم وما یسطرون۔

نٓ: اسی وجود پاک کی حقیقت اولیہ ہے جو سارے عالم میں جاری وساری ہوئی اور پھیلی۔

اور قلم اسی کا نام ہے بحیثیت تاثیر فی العالم۔

وما یسطرون۔ باقی مخلوقات ومکونات وموجودات ہیں اس کے واسطے اور وسیلے سے وجود میں آئی ہیں اور قرآن وحدیث میں اسی نور اول کو الماء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وجعلنا من الماء کل شی حیی۔ ہر زندہ چیز کو الماء (پانی) سے پیدا کیا گیا ہے اور حدیث نبویؐ ہے۔

کل شی خلق من الماء۔ کہ ہر ایک شی پانی سے خلق کی گئی ہے۔

تشریح۔ زمین وآسمان اور مخلوقات ارضی کی خلقت تو پانی سے ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن کل شی۔ بالاطلاق مقتضی ہے کہ ہر ایک شی ارض ہو یا سماوی روحانی ہو یا غیر روحانی کل کی خلقت پانی سے ہو اور یہ محال ہے کہ روحانیات کی خلقت اس پانی سے ہو جو مرکب جسم ہے (موجودہ پانی) جسمانیات کی خلقت اس پانی سے ممکن ہے لیکن اگر اس آیت کو حقیقی معنی لغوی پر محمول کیا جائے اور جب تک کوئی یقینی قرینہ صادرفہ عن الحقیقت نہ ہو۔ معنی مجاز لینا درست بھی نہیں تو اس کی تائید ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد حقیقی معنی ہیں۔ یعنی ایک شی پانی سے خلق ہوئی ہے اور پانی اول مخلوق ہے اور یہ ثابت ہوا کہ یہ وہ پانی تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس آیت کے مفہوم بلکہ منطوق کو اگر ان احادیث سے مطابق کیا جائے جن میں وارد ہے کہ کل اشیاء نور محمدؐ وآل محمدؐ سے خلق ہوئی ہیں۔ تو معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں کہ اس پانی سے اور اس ماء سے مراد یہی نور محمدی ہے نہ یہ مرکب جسم (پانی) شفاف سیال۔

**اوّل**: یہ نور..... نور اولی ہے اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ کوئی شی نہ تھی۔ نہ فلک نہ زمان نہ مکان نہ زمین نہ آسمان نہ جن نہ انسان نہ نبات نہ حیوانات اور اس نور

کے پھیلنے کے لئے کوئی شی حاجب و مانع نہ تھی۔ پس گویا کل عالم امکان اس نور ہی سے پُر تھا۔ یہ دریائے نور اپنی چمک دمک کے ساتھ موجیں لے رہا تھا۔ پھر دریائے نور تمام موجوداتِ عالم امکان کے لئے آب حیات بنا۔ اسی سے انہوں نے وجودِ حیات پایا۔ نورانیت' صفا اور تمام عالم و عالمیان میں جریان و سرایت کے لحاظ سے اس کو (پانی یا آب حیات) کہا گیا۔ وجعلنا من الماء کل شی حی۔ صادق آیا۔

**دوم**: دوسری وجہ یہ ہے کہ حقیقت نورانی روحانی نبوی جو صادر اوّلی ہے حقیقت نورانیہ علمیہ ہے اور وجودِ اقدس نبوی حامل علم الٰہی ہے اور عالم روحانی میں علم کو پانی سے مشابہت ہے۔ چنانچہ اکثر روایات سے ثابت ہے کہ جس وقت انسان پانی خواب میں دیکھے تو اس کی تعبیر علم خالص عن الشبہات ہے۔

عارفین و محققین کے نزدیک مسلم ہے کہ ہر ایک عالم میں ہر ایک شی کی صورت جداگانہ ہوتی ہے اور عالم مثال یا عالم دہری میں یہاں کی ہر ایک شی کی صورت ہے۔ پس اس حقیقت نورانیہ علمیہ کا پانی سے تشبیہ دینا نہایت موزوں اور مناسب ہے اور یہ پانی نہیں ہے مگر نور محمدؐ و آل محمدؐ اور اس سے ہر ایک شی کی حیات ہے اور یہی آب حیاتِ عالم ایجاد ہے۔

ایک تشبیہ صورت ظاہری سے اور ایک تشبیہ صورت روحانی سے اور دونو مناسب حال وجعلنا من الماء کل شی حی۔

جب یہ ثابت ہے کہ مخلوق اولی یہ حقیقت نورانیہ محمدؐیہ ہے اور جب عالم ایجاد میں کچھ نہ تھا یہ حقیقت نورانیہ اور یہ دریائے نور اس میں موجزن تھا اور یہ بحر مسجور ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور یہی دریائے نور حامل عرشی الٰہی (علم الٰہی) تھا۔

ثابت ہے کہ حقیقت حامل عرش الٰہی علم تقدیری ہے۔ پس اس عنوان سے کان عرشه علی الماء کے معنی بالکل واضح ہو گئے کہ ماء سے مراد حقیقت نورانی محمدیہ ہے۔ اور عرش سے مراد وہ علم الٰہی ہے جس کے حامل اس وقت جس وقت کہ عالم ایجاد میں کچھ نہ تھا۔ نہ زمین تھی نہ آسمان تھا اور یہ عرشِ الٰہی پانی پر تھا۔ حقیقت نورانیہ محمدیہ تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ حکیم ازلی نے قدر خلق العالم فی علمه ثم قضی علیه ووقع التقدیر العقلی فی عالم الایجاد علی علمه فاستوی الله سبحانه علی عرشه وهو قوله ثم استوی علی العرش۔ یعنی اس حکیم ازلی نے اپنے علم میں عالم امکان کی خلقت کو مقدر کیا اور اندازہ کیا کہ یہ یہ چیزیں اس کمیت و کیفیت و صورت و شکل اجل میعاد (مسمی) و معلق اسی رزق و روزی کے ساتھ خلق کروں گا۔

جب زمین و آسمان کو خلق فرمایا اور ان کی اقوات (قوت کی جمع) و ضروریات مقدر اور مقرر کر لیں اور ہر ایک امر متعلق آسمان و زمین ودیعت کر دیا تو وہ قادر مطلق اس تقدیر پر بالفعل غالب آ گیا اور اس کی قدرت و علم کے آثار عالم ظہور میں آئے اور جو چاہا تھا اور جس کو مقدر کیا تھا اور قضا (فعلی) جاری ہوئی تھی۔ اسی طرح مکمل عالم بن گیا۔ فقال ثم استوی علی العرش۔ یعنی اس تخلیق و تکوین فعل کے بعد وہ اپنی تقدیر علمی پر غالب آیا اور وہ عالم ایجاد میں آ گئی اور بالفعل عالم موجود ہو گیا۔ فخلق السموت والارض فی سته ایام و کان عرشه علی الماء۔

☆☆☆☆☆

# درس نہم

انبیاء کیلئے عصمت واجب ہے۔ یعنی نبی کا موصوم ہونا واجب ہے۔
عصمت کی تعریف: اَلعِصَمۃُ لُطفٌ خَفِیٌّ یَفعَلُ اللّٰہُ بِالمُکَلَّفِ بِحَیثُ لَایَکُونُ لَہٗ دَاعٍ اِلٰی تَرکِ المطَّاعۃِ وَارتِکَابِ المَعصِیَۃِ مَعَ قُدرَتِہٖ عَلٰی ذَالِکَ۔ (شرح باب حادی عشر از علامہ حلیؒ)

عصمت اللہ کا ایک لطف خفی (پوشیدہ) ہے جو وہ مکلف (انسان) کے ساتھ فرماتا ہے اس حیثیت سے کہ مکلف ترکِ طاعۃ وارتکابِ معصیت (گناہ) پر قادر ہوتے ہوئے ترک طاعۃ وارتکاب معصیت نہیں کرتا۔

## عصمت

عصمت کی لفظ اپنے جملہ مشتقات کے ساتھ قرآن میں تیرہ مرتبہ وارد ہوا ہے۔ یہ لفظ ''ریشہ شناسی'' کے اعتبار سے صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی عصمت کے معنی تمسک و نگاہ داری اور ممانعت (روکنا) ہے۔ قرآن میں اپنی معنی میں

استعمال ہوئی ہے۔

1- وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ( آل عمران:103)

یعنی اللہ کی رسی سے تمسک کرو اور متفرق نہ ہو جاؤ۔

2- اسی طرح عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) کی دعوت قبول کرنے سے حضرت یوسفؑ کے انکار کا ذکر کرتے ہوئے قرآن اسی لفظ کو استعمال کرتا ہے۔

وَلَقَدْ رَاوَدتُّهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ۔

یعنی میں نے (زلیخا) نے کہا اس (یوسفؑ) کو اپنی طرف بلایا لیکن اس (یوسفؑ) نے خودداری سے انکار کر دیا۔

اس آیت میں اعتصمام سے تمسک و نگہداری مراد ہے۔ بعض اوقات لفظ عصمت۔ سپر یعنی ڈھال کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ یعنی انسان کو بُرے حوادث سے روکنے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے۔ لغت عرب میں عصام اسی رسی کو کہتے ہیں جس سے حمال اپنے بار کو باندھتے ہیں تا کہ وہ کھلنے، گرنے اور متفرق ہونے سے بچا رہے لہٰذا عصمت سے مراد ہر غلط کام کی خواہش وارادہ اور خطاء واشتباہ سے مصئون و محفوظ رہنا ہے۔

## عصمت کی تعریف

قوة تمنع الانسان عن اقتراف المعصية والوقوع في الخطاء۔ (محققین کے نزدیک۔ از تفسیر موضوعی از جعفر سبحانی المیزان ج 2 ص 142 مطبوعہ ایران)

عصمت ایک ایسی باطنی قوت ہے جو کسی معصوم کو نہ صرف مطلقاً ارتکابِ گناہ سے روکتی ہے بلکہ گناہ کے بارے میں سوچنے سے بھی مانع ہے۔ اگر یہ کیفیت ان سے چھین لی جائے تو پھر وہ عام انسانوں کی مانند ہو جائیں گے۔ جو صرف عصمت نسبی کے حامل ہونگے۔ عصمت مطلقہ کے نہیں۔

عصمت کی تعریف: اَلعِصمة تفضل من الله تعالیٰ علی من علم انه یتمسک بعصمته۔ (شیخ صدوقؒ تصحیح الاعتقاد ص 1)

عصمت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک تفضّل (فضل) ہے اس شخص کے لئے جو اس کی عصمت سے تمسک کا متلاشی ہے۔

عصمت کی تعریف: العصمة هی لطف الله الذی یفعله تعالی فیختار العبد عنده الامتناع عدفعل القبیح۔ (سید مرتضیٰؒ علم الھدیٰ ملخصات اوائل المقالات ص 111)

عصمت ایک لطف الٰہی ہے جب وہ کسی بندہ کو عنایت ہوتی ہے تو وہ ترکِ قبیح کی جانب بڑھنے کا انتخاب کرتا ہے۔ عصمت لطف الٰہی ہے جو خدا تعالیٰ کی عنایت ہے اس کے ہوتے ہوئے بھی ترکِ واجب اور ارتکاب گناہ پر کوئی داعی پیدا نہیں کرتا۔ پھر اپنی کتاب اللوامع الالهية۔ (تکملہ امالی المرتضیٰؒ کشف المراد ص 228 اللومع الٰہیہ ص 169) میں فرماتے ہیں کہ عصمت لطف الٰہی ہے جس کی موجودگی میں صدور معصیت، دائمی گناہ نہ ہونے کی بنا پر ممتنع ہو جاتا ہے لیکن اس صورت میں بھی انسان کے گناہ کرنے کی قوت محفوظ ہو جاتی ہے۔ (علامہ حلیؒ اور فاضل مقداد کشف المراد ص 228)

عصمت کی تعریف: العصمة ان لایخلق الله تعالی الذنب فی العبد مع بقاء قدرته واختیاره۔ (علامہ نسفی از اہل تسنن شرح عقائد نسفیہ ص 185 طبع آستانہ از تفسیر موضوعی)

## مختلف آراء: (عصمت کے بارے میں)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ معصوم ارتکاب معصیت پر قادر نہیں ہوتا لیکن یہ خیال غلط ہے اگر ارتکاب معصیت پر قادر نہ ہوگا تو ترکِ معصیت پر قابل مدح نہ رہے گا۔

خوارج کے نزدیک انبیاء علیہم السلام سے گناہ کا صدور ہوتا ہے اور ہر گناہ ان کے نزدیک کفر ہے۔

فرقہ حشویہ: انبیاء علیہ السلام سے گناہ کبیرہ کے صدور کو جائز سمجھتا ہے اس فرقے کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انبیاء علیہ السلام سے عمداً گناہ کبیرہ کا صدور نہیں ہوتا سہواً گناہ کبیرہ صدر ہوسکتا ہے اور گناہِ صغیرہ کا صدور عمداً ہوسکتا ہے۔

فرقہ اشاعرہ: کے نزدیک انبیاء علیہ السلام سے گناہ کبیرہ نہ عمداً صادر ہوتا ہے نہ سہواً۔ البتہ گناہ صغیرہ کا صدور سہواً ہوسکتا ہے۔

فرقہ امامیہ: کے نزدیک انبیاء علیہ السلام تمام گناہانِ کبیرہ وصغیرہ سے معصوم ہوتے ہیں ان سے کسی قسم کا گناہ نہ عمداً صادر ہوسکتا ہے نہ سہواً۔ یہی مذہب حق ہے۔ فرقہ امامیہ کے علاوہ جو لوگ عصمت انبیاء کے قائل ہیں وہ اس امر کے قائل ہیں

کہ انبیاء بعد نزول وحی معصوم ہوتے ہیں۔ لیکن نزولِ وحی سے قبل یہ لوگ عصمت انبیاء کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ اس بات کے قائل ہیں کہ نزول وحی سے قبل انبیاءؑ کافر نہیں ہوتے اور نہ گناہوں پر اصرار ہوتا ہے۔ صدور گناہ عمداً ہوسکتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا اول عمر سے آخر عمر تک معصوم ہونا ضروری ہے۔ ہم فرقہ شیعہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت مطلقہ کے قائل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے کوئی گناہ نہ قبل وحی ہوسکتا ہے اور نہ بعد وحی آخر عمر تک ان سے کوئی گناہ ہوسکتا ہے۔

علامہ شیرازی محمد حسینی از شرح تجرید۔

عصمت کی تعریف: العصمة حالة نفسانية فانعة عن ارتكاب المعاصى صغيرها وكبيرها من دون كون تلك اطالة بالغة لحد الالجاء۔

عصمت نفس میں ایسی قوت، حالت کا نام ہے جو اپنے حامل کو بلا جبر و اکراہ صغیرہ و کبیرہ کے ارتکاب سے مانع ہو۔ مثلاً ایک شفیق اور مہربان ماں اپنے بچے کے قتل پر قادر ہوتی ہے لیکن وہ اسے قتل نہیں کرتی۔ ماں کا بچے کیلئے عدم اقدامِ قتل ماں پر کسی جبر کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کے نفس میں بچے کے لئے ایسے جذبات ہیں جن کے پیش نظر وہ بچے کے قتل کا سوچتی بھی نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح معصوم گناہ پر قدرت رکھتے ہوئے گناہ کے ارتکاب کا سوچتا بھی نہیں ہے۔ یا ہر شخص اپنی آنکھ پھوڑنے، کان کاٹنے یا زبان کاٹ لینے پر قادر ہوتا ہے۔ لیکن کبھی اس نے ایسا نہیں سوچا اور نہ ہی کیا ہے اس میں کسی جبر و اکراہ کا دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذاتی نفسانی حالت ہی اسے ایسے کرنے سے مانع ہوتی ہے۔

نبیؐ کا معصوم ہونا واجب ہے۔

**دلیل 1**- مقصد بعثت تبلیغ ہے۔ لوگ اس نبیؐ سے احکام سنیں گے جب انہیں نبیؐ پر اعتماد ہو اور نبیؐ پر اعتماد صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب نبی معصوم ہو۔ یعنی مقصد بعثت صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب نبی معصوم ہو۔

**دلیل 2**- اگر نبی معصوم نہ ہو تو بیک وقت نبیؐ کی اتباع اور عدم اتباع ہر دو واجب ہوں گی کیونکہ مقصد بعثت اتباع نبیؐ ہے۔ جب نبی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس حیثیت سے کہ وہ نبیؐ واجب الاتباع ہے اس کی اتباع واجب ہو گی اور اس حیثیت سے کہ معصیت میں کوئی اتباع نہیں ہوتی۔ نبیؐ سے تنفر اور اجتناب واجب ہو گا تو نتیجہ اجتماع ضدین ہو گا جو محال مطلق ہے۔

**دلیل 3**- اگر نبیؐ غیر معصوم ہو تو امت پر انکار نبیؐ واجب ہو گا اور انکار نبیؐ ایذاء نبیؐ ہے اور ایذائے نبیؐ حرام ہے۔ اس صورت اجتماع ضدین ہو گا۔ کیونکہ نہی عن المنکر کے وجوب کی وجہ سے معصیت کے ارتکاب پر نہ صرف نبیؐ کی اتباع واجب نہ ہو گی بلکہ اسے ارتکاب معصیت سے روکنا بھی واجب ہو گا۔ جبکہ روکنے سے نبیؐ کو اذیت ہو گی اور ایذائے نبی حرام ہے۔ ارشاد باری ہے۔ **والذین یوذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والآخرہ** جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دی اس پر دنیا و آخرت میں لعنت ہے۔

**دلیل 4**- اگر نبیؐ غیر معصوم ہو اور کسی بدکاری کا معاذ اللہ ارتکاب کر بیٹھے تو وہ مردود الشہادۃ ہو گا۔ یعنی اس کی گواہی نا قابل قبول ہو گی۔ کیونکہ فاسق کی شہادت (گواہی) اجماعاً نا قابل قبول ہے۔ ارشاد باری ہے۔ **ان جاء کم فاسق بنباء**

فتبینوا۔ اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی صحیح چھان بین کرو۔ شہادتِ نبی کا رد کرنا باطل ہے۔ کیونکہ جس شخص کی شہادت مال دنیا میں قبول نہیں ہوگی اس کی شہادت دین قیم میں کیسے قبول کی جائے گی۔ لہٰذا نبی کا غیر معصوم ہونا باطل ہے۔ عہدہ نبوت و امامت الٰہی عہدے ہیں اور اپنے عہدہ کے لئے اللہ نے اٹل قانون بنا دیا ہے۔ لاینال عھدی الظالمین۔ اس عہدے سے مراد بھی نبوت و امامت کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ظاہر ہے وہی ظالم نہیں ہوگا جو معصوم ہوگا۔ غیر معصوم ظلم کی کسی نہ کسی صورت میں لامحالہ ملوث ہوگا۔

یہی وہ معصومین افراد ہیں جو درج ذیل آیت کریم کے مصداق ہیں۔ ومن المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ۔ یعنی مومنین میں سے کچھ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے معاہدے کیا تھا اس (عہد) کو سچ کر دکھایا ہے اور اس پر ثابت قدم رہے جو انھوں نے خدا سے کیا تھا۔ جس کا صریح مطلب یہی ہے کہ مومنین میں سے کچھ لوگ ضرور ایسے ہیں جو عہد خدا پر قائم اور اس معاہدے میں سچے ہیں کہ شیطان کی اطاعت و متابعت نہیں کرتے بلکہ کسی ادنی امر میں بھی ان سے متابعت شیطان سرزد نہیں ہوئی۔ اگر چشم زدن کے واسطے بھی کسی ادنی معصیت میں شیطان کی متابعت ان سے سرزد ہوئی تو وہ معاہدہ الٰہی میں سچے اور صادق العہد والوعد نہ کہلاتے۔ بالفاظ صریح اگر یہ ادنیٰ سے گناہ کے بھی مرتکب ہو جاتے تو عہد خدا سے خارج ہو جاتے اور صادق العہد والوعد نہ رہتے۔ پس ضرور یہ لوگ معصوم مطلق ہیں۔ ابتداء عمر سے آخر عمر تک ہر ایک امر میں خواہ تکالیف سے متعلق ہو یا تشریع و تبلیغ سے چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔

ان معصومین میں سب سے اول و مقدم اور سب کی اصل حضور پاک سرور

کائنات علیہم السلام ہیں اور فرع اہلبیت علیہم السلام ہیں۔ جو سب کے سب بتصدیق آیات مذکورہ نیز بتصریح آیۂ تطہیر معصوم و مطہر اور ہر عیب و نقص سے مبرا و منزہ ہیں۔ لہٰذا از روئے قرآن کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ معاذ اللہ آنحضرتؐ سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا۔ قرآن سے سرکارؐ کی عصمت مطلقہ مثل آفتاب نصف النہار روشن و درخشاں ہے اب صرف قابل ذکر ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ جب ایسا ہے تو پھر (ذنب) کی نسبت حضرتؐ سے کیوں دی گئی ہے۔ (سورہ فتح پ 26)

انا فتحنا لک فتحا مبینا یغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخر ویتم نعمتہ علیک ویھدیک صراطا مستقیما وینصرک اللہ نصرا عزیزا۔ اس کے متعلق اولا یہ عرض ہے کہ جب دیگر آیات سے حضرتؐ کی عصمت ثابت تو ایسی آیات ضرور کسی دوسرے محل صحیح پر محمول ہوں گی اور اس نسبت میں ضرور حسب قاعدہ کلیہ ہر زبان و اہل زبان حال منسوب و مضاف الٰہیہ کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ کیونکہ اضافت و نسبت اصل وضع میں داخل ہے اور الفاظ کے معانی بلحاظ منسوب الٰہیہ و مضاف الٰہیہ لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ جمیع عقلاء و علما ملل کے نزدیک مثلاً لفظ علم جب خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنی ذات واجب الوجود و خالق و علم و قدرت کے لحاظ سے لئے جائیں گے اور یہ لفظ علم اس کی مخلوق کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنی ذات حادث و مخلوق کے لحاظ سے معتبر ہوں گے۔ اگرچہ اللہ عالم و زید عالم دونوں صحیح ہیں اور دونوں مقام پر لفظ ایک ہے اور نسبت مساوی لیکن منسوب الٰہیہ جدا جدا ہیں۔ اس لئے علم خدا کے معنی اور ہیں اور علم زید کے معنی اور ہیں یا یوں سمجھئے کہ لفظ ابن (بیٹا) ایک وقت عام انسانوں کی طرف منسوب ہوتا ہے اور ایک وقت اصطلاح یا

اعتقاد عیسوی میں خدا کی طرف کہ حضرت عیسیٰؑ کو ابن کیا جاتا ہے۔ لیکن اگرچہ یہ نسبت عندالتحقیق غلط اور باطل ہے۔ مگر خود ان منسوب کرنے والوں اور اس اعتقاد والوں کے نزدیک بھی ابن اللہ کے وہ معنی نہیں ہیں جو دوسرے انسانوں میں لئے جاتے ہیں اور کوئی عالم تو کیا کون جاہل سے جاہل عیسائی بھی یہ نہیں کہے گا کہ معاذ اللہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے نطفے سے بطور توالد و تناسل عادی پیدا ہوئے ہیں اور خدا کے صلبی فرزند تھے۔ وہ باعتبار کمالِ ظہورِ صفات الٰہیہ ذاتِ خدا سے متحد مانتے ہیں۔ اگرچہ وہ غلط اور باطل ہے۔ کیونکہ اتحاد ذات خالق و مخلوق واجب و ممکن محال ہے۔ بہرحال لفظ ابن ایک ہی ہے۔ لیکن بلحاظ استعمال و منسوب الٰہیہ معنی علیحدہ۔ ابن اللہ کے معنی اور ہیں اور ابن زید کے معنی اور لحاظِ منسوب الٰہیہ و مضاف الٰہیہ ہر زبان میں معتبر و ملحوظ ہے۔ بنابریں ضروری ٹھہرا کہ ہم لفظ ذنب کی نسبت میں موافق قواعد مقررہ غور کریں اور دیکھیں کہ ذنب کہتے کس کو ہیں اور آنحضرتؐ کے ساتھ نسبت دینے سے کس لطیف حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

ضرور بحکم قواعد وضع الفاظ و مسلمات فطریہ و مستقلاتِ عقلیہ جو معنی ذنب کے دیگر ممکن الخطاء و جائز المعصیت غیر معصومین لوگوں کی طرف منسوب ہونے میں ملحوظ ہونگے وہ ایک ایسے شخص کی طرف منسوب ہونے میں معتبر نہیں ہو سکتے جس کی عصمت و عفت بدلائل ثابت ہو اور شواہد بینہ و تجربات حسیہ اس پر دال ہوں۔ جیسا کہ حضرتؐ کے عادات و اخلاق و معاشرت سے واقف لوگوں کے اقرار و اعتراف سے ثابت ہے۔ کوئی تاریخ اس کی شہادت نہیں دے سکتی کہ آنحضرتؐ کے ان مخالفین نے جو حضرتؐ کے خون کے پیاسے اور دین حضرتؐ کو مٹانے پر تیار اور ہر وقت کمربستہ تھے

اور ہر ایک ممکن تدبیر سے مسلمانوں اور مسلمان ہونے والوں کو حضرتؑ سے متنفر اور متنفر کرنے پر تلے رہتے تھے۔ کبھی یہ کہا ہو کہ اس مدعی نبوت و رسالت پیغمبرؐ امی عربی سے فلاں وقت فلاں معصیت صادر ہوئی ہے۔

جادوگر کہتے تھے مجنون کہتے تھے مگر کبھی کسی نے گنہگار و معاذ اللہ بدکار نہیں کہا۔ حالانکہ علماء یہود و نصاریٰ موجود و مقابل تھے۔ یہ اعتراض انہوں نے بھی اس وقت نہیں کیا لہٰذا ہزار پانچ سو برس کے بعد اگر کوئی حضرتؑ کی ذاتِ پاک پر دھبہ لگائے یا اپنی تائید میں کسی دشمن دین کی روایت گھڑی گھڑائی پیش کر دے تو وہ مُنصفین اور عقلاء کے نزدیک ہرگز قابل سماعت نہیں ہو سکتی۔ جو شخص علم و یقین اور اپنی خمیر و بصیرت کے خلاف کرنے یا کہنے کا عادی نہیں ہے وہ ضرور ایسے الفاظ میں غور و تامل سے کام لے گا جس سے اس حقیقت اور اصلیت پر اشتباہ ہوتا ہے۔

ہم اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لئے آیاتِ قرآنی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ گناہ کی سات اقسام ہیں۔

1-زلل۔ 2-سیئۃ۔ 3-خطیئہ۔

4- کبیرہ۔ 5-فاحشہ۔ 6-جرم۔

7-ذنب

## 1-زلل

زلل کے معنی لغزش اور پیر پھسل جانا کے ہیں۔ اس سے زلۃ الاقدام و مزلۃ الاقدام ہے۔ معمولی لغزش کہا جاتا ہے۔ زلل کی نسبت حضرت آدمؑ کی طرف ہے۔ وہ

بھی ازلال ہے نہ زلل۔ فازلھا الشیطان عنھا۔شیطان نے ان کو پھسلایا کہ آپ کے سامنے اسم حضرت حق کی جھوٹی قسم کھائی۔ (قاسمھما انی لکما لمن الناصحین) شیطان نے آدمؑ وحواؑ کے لئے قسم کھائی اور کہا کہ میں تمہیں نصیحت کرنے والوں میں سے ہوں۔ جیسے کوئی شخص ڈھلان کی جگہ پھسلنے والی چیز ڈال دے اور اس کو چھپا دے اور کسی چلنے والے کا پیر پھسل جائے تو وہ ہرگز مستحق مذمت نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی صورت میں گزرنے والے کا کوئی قصور نہیں اور اس کو کوئی برا نہ کہے گا کہ تو کیوں گرا۔ بلکہ اس کو دھوکہ دینے والے کا قصور ہے۔ سب اس کو برا کہیں گے۔ لہٰذا لغزش گناہ سے تعبیر نہیں کی جاتی۔

## 2-سیّئۃ

عام سیئات ایسی بدیاں ہیں جو نیکیوں کے کرنے سے اور ان کے مرتکب ہونے سے برطرف ہو جاتی ہیں اور خدا ان کا کفارہ کر دیتا ہے۔ ان الحسنات یذھبن السیات (ھود) ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنه فکفرعنکم سیناتکم۔ اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرو گے جن سے نہی کی گئی ہے تو تمہاری سیئات کو ہم خود کفارہ کر دیں گے اور مٹا دیں گے۔ تکفیر۔ ڈھانپ دینے اور چھپا دینے کو کہتے ہیں۔ غافر الذنوب وستار العیوب ایسی بدیوں کو خود ہی چھپا دیتا اور محو کر دیتا ہے۔

## 3-خطیئہ

خطاء کی ضد صواب ہے۔ من قتل مومنا خطاء۔ ایک شخص شکار کھیل رہا

تھا یا اپنے قاتل کو نشانہ بنا رہا تھا اور گولی کسی دوسرے کے لگ گئی اور وہ مر گیا یا بلا قصد قتل بغرض ڈرانے یا دھمکانے کے اس نے حملہ کیا اور وہ شخص ہلاک ہو گیا۔ یہ سب قتل خطاء ہیں۔ ایسے افعال جو از روئے غفلت یا جہالت یا عدم معرفت سے خلاف صواب وخلافِ طریق صواب سرزد ہوں۔ خطیات کہلاتی ہیں۔

## 4- کبیرۃ

کبائر وہ امور منہی عنہا جن پر وعید عذاب جہنم کیا گیا ہے۔ کبائر کہلاتے ہیں۔ جن کے مرتکب پر خدا غضبناک اور ناراض ہوتا ہے۔

کذب (جھوٹ) مع اقسام ستہ 6 کبائر میں داخل ہے۔

آیت: **کبر مقتا عنداللہ ان تقولوا مالا تعقلونo ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ۔** سے ظاہر ہے کہ عام سیات سے کبائر بڑھے ہوئے ہیں اور سیئات اس وقت کا کفارہ ہو سکتا ہے جب کہ انسان کبائر کا مرتکب نہ ہو۔

## 5- فاحشہ:

زنا وغیرہ جیسے فحش افعال شنیعہ وقبیحہ کو کہتے ہیں۔ جیسے **لاتقربوا الزنا انہ کان فاحشا وساء سبیلا۔**

## 6- جرم:

سب سے آخری درجہ ہے اور مقام انتقام ہے **انا من المجرمین منتقمون** اول مجرمین کفار ومشرکین ومنکرین انبیاء ومرسلین واوصیاء انبیاء ومرسلین

ہیں۔ وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمینo اسی طرح سے ہم نے ایک نبی کے لئے مجرمین میں سے ایک دشمن قرار دیا ہے لہٰذا ضرور منکرین و دشمنانِ انبیا علیہم السلام مجرمین ہیں۔ جن کے لئے آخرت میں کسی قسم کی فلاح و رستگاری نہیں اور وہ مستوجب انتقام ہیں اور اس لئے کوئی نبی مجرمین میں داخل نہیں ہو سکتا اور جرم کا اطلاق اسی پر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان (انبیاء) کے مخالف و مقابل و منکر و مجادل مجرمین ہیں۔ کوئی پیغمبر اوحیاء مرتکب فواحش نہیں ہو سکتا۔ ذوات انبیاء علیہم السلام ایسے افعال شنیعہ وقبیحہ سے منزہ و مبرا ہیں۔

## 7-ذنب

ما تقدم من ذنبک وما تاخر۔ (سورہ فتح)

ذنب لغت میں ذَنَب سے نکلا ہے۔ ذنب۔ دم کو کہتے ہیں۔ اور ذنب الناس لوگوں کی دم۔ ایسے ادنی درجے کے لوگوں کو کہتے ہیں جو دوسروں سے پیچھے ہوں اور ان سے مکارم اخلاق و آداب و علوم و فنون میں کم اور پست لہٰذا ذنب کا ترجمہ فارسی میں ہم (پس افتادگی) کر سکتے ہیں اور از روئے لغت عرب یہی معنی صحیح و درست ہیں۔ بنابریں اہل ذنوب وہ لوگ ہیں جو سلوک طریق الٰہی و صراط مستقیم عالم آخرت میں بلحاظ حصول کمالاتِ روحانیہ انسانیہ و مکارم اخلاق و آداب و ملکاتِ حسنہ نفسانیہ دوسرے لوگوں کے پیچھے اور پست رہ گئے ہوں۔

اور ظاہر ہے جو لوگ معصوم نہیں ہیں اور مرتکب معاصی و مناہی ہوتے ہیں اور ان سے سیئات یا خطیات یا کبائر یا فواحش سرزد ہوتے ہیں ان کو جس طرح مسئ

(گنہگار) خاطی (خطا کار) اہل کبائر اور اہل الفحشا کہا جاتا ہے اہل الذنوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ بوجہ نہ کرنے نیکیوں کے اور نہ بہم پہنچانے توشۂ آخرت اور نہ تحصیل کرنے ملکات فاضلہ نفسانیہ ان لوگوں سے پست اور ان سے پیچھے ہیں جو ہر امر خیر کی طرف سبقت کرتے ہیں اور میدانِ تحصیل کمالات و ملکات فاضلہ میں گوئے سبقت لے گئے ہیں۔

چنانچہ آیۃ مجیدہ: اصحاب المیمنۃ ما اصحاب المیمنہ ما اصحاب المشئمۃ ما اصحاب المشئمہ والسابقون السابقون اولیک المقربون۔ اصحاب الیمین مومنین کرام اصحاب الشمال کافرون ومنافقین اور السابقون انبیاء واوصیاء کرام ہیں۔

اب سرکار دو عالم کی طرف لفظ ذنب کی نسبت بایں معنی ہرگز درست نہیں ہے کہ وہ معاذ اللہ بوجہ مرتکب ہونے معاصی ومناہی دوسروں سے پست و پس افتادہ تھے بلکہ سرکار اول السابقین الی الخیرات ہیں اور اول المسلمین واول المومنین ہیں بلکہ اقرار الولھیت میں الست بربکم کے جواب میں سب سے پہلے بلیٰ کہنے والے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر معاذ اللہ سرکار اہل ذنوب میں سے ہوتے تو وسیلہ مغفرت ذنوب عباد نہ ہوتے حالانکہ آیت شریفہ میں ہے۔ ولو اذ انھم ظلموا انفسھم جاؤوک واستغفروا اللہ واستغفرلھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیماo سے آشکارا ہے کہ رسول خدا اگر ان لوگوں کے لئے جو اہل الذنوب ہیں طلب مغفرت واستغفار فرمائیں تو ضرور ہی خدا ان کو بخش دے گا اور ان کے گناہ معاف کردے گا۔ حالانکہ گنہگار کسی گنہگار کو نہیں بخشوا سکتا۔ جیسا کہ یہاں کوئی مجرم کسی

مجرم کی سفارش نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اگر حضرت معاذ اللہ گنہگار ہوتے تو وسیلۂ مغفرت نہ قرار پائے اور آیت کا مفہوم یہی ہے کہ وہ وسیلۂ مغفرت ہیں۔

ہاں۔ ذنب پس افتادگی دو طرح کی ہو سکتی ہے ایک بصورت مذکورہ یعنی اختیار و ارادے سے اور ایک دوسری صورت یہ ہے کہ چونکہ کمالات متفاوت و مراتب و درجات مختلف ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک نیک بندہ اپنے اختیار و ارادے سے کوشش کرتا اور چاہتا ہے کہ وہ درجات عالیہ حاصل کرے تمام مراتب رفیعہ اس کو حاصل ہو جائیں جو اعلیٰ درجے کے اعمال و افعال میں وہی کرے ادنیٰ اور گھٹیا درجے کا کام نہ کرے۔ بلکہ چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت و ہر آن اس سے اعلیٰ ہی اعلیٰ کارنمایاں ہوں۔ مگر چونکہ دنیا عالم اسباب ہے بعض اوقات اس کو ایسے اسباب مہیا نہیں ہوتے کہ ان اعلیٰ مراتب و درجات کو اس وقت حاصل کرے اور ان اعلیٰ مقاصد پر کامیاب ہو۔ حواس کے مطمع نظر ہیں۔ تعظیم فی عین الصغیر صغارها وتصغر فی عین العظیم العظائم۔ بڑوں کی نظر میں بڑے بڑے کام بھی چھوٹے اور حقیر ہی ہوتے ہیں اور وہ اگر ایک وقت اپنے خیال و ارادے کے موافق اعلیٰ کام انجام نہ دے اور عظائم امور کا مرتکب نہ ہو تو وہ اپنے کو اس حالت میں بہ نسبت ان مقاصد عالیہ رفیعہ پست خیال کرے گا اور حقیقت میں ہے بھی ایسا ہی۔ پیغمبرؐ جو اپنی امت یعنی بنی نوع انسان پر نہایت ہی مہربان ہے اور ہدایت پر نہایت ہی حریص۔ قدجاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمومنین روف رحیم۔ چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ سب ہدایت پر آئیں اور ہلاکت و ضلالت سے نجات پائیں۔ وہ اس حالت کو جس میں وہ اپنے اس اعلیٰ

مقصد پر بدرجہ کمال کامیاب نہیں ہے۔ پستی و پس افتادگی خیال کرتا ہے اور اسے ذنب سمجھتا ہے اور مراتب عالیہ میں کمی تصور کرتا ہے۔ یہ امر آشکارا و ہویدا ہے کہ بعد فتح مکہ و مغلوبیت مشرکین و دشمنان دین یہ کمیاں پوری ہو جاتی ہیں۔ پیغمبرؐ آزادی سے دعوت دے سکتا ہے۔ موانع و عوائق ہدایت برطرف ہو گئے ہیں۔ خانہ کعبہ کو پاک صاف کر کے جو بت خانہ بنا ہوا تھا صدائے اللہ اکبر بلند کرتا ہے۔ اس فتح نمایاں پر خدا فرماتا ہے۔ انا فتحنا لک فتحا مبیناo اے پیغمبر تو تنگ دل و کبیدہ خاطر نہ ہو موانع و عوائق جو تیرے مقاصد عالیہ کے حصول میں سد راہ تھے ہم نے سب برطرف کر دئے۔ تیرے واسطے ہدایت و دعوت الی الاسلام کے دروازے اس فتح نمایاں سے کھول دئے۔

لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخر۔ تا کہ خدا تیری پہلی اور پچھلی تمام کمیاں پوری کر دے۔ یعنی ان کمیوں اور ان حالتوں کو جن میں تجھے یہ مواقع حاصل نہ تھے اور آئندہ جو بوجہ غلبہ دشمنان دین برآل پیغمبر کمیاں واقع ہوں ان سب کو خدا نے آج کے دن اور ان حالتوں اور اوقات کے برابر و مساوی کر دیا اور یہ فتح نمایاں اس لئے دی گئی کہ خدا اپنے انعامات اور نعمتوں کو پورا کر دے اور تیرے لئے ہدایت کا سیدھا راستہ کھول دے اور تیری ایسی مدد کرے جو حق مدد کرنے کا ہے اور غلبہ کل عطا کرے۔

غفر: کے معنی نعت میں سوراخ بند کر دینا۔ رخنوں کو برابر کر دینا ہے۔ پس ابتدائے دعوت میں حصول مقاصد عالیہ و درجات رفیعہ میں جو کمیاں بوجہ غلبہ دشمنان دین و عدم تہیہ اسباب واقع ہوئی تھیں فتح مکہ سے ان موانع کو برطرف کر کے خدا نے

وہ تمام کمیاں پوری اور تمام رخنے پر کر دئے اور اول عمر سے آخر عمر تک تمام مراتب نبوی کو ایک درجہ مساوی میں کر دیا اور یہ خاص تفضل الٰہی ہے اپنے محبوب کے لئے جو کسی دوسرے کو عطا نہیں ہوا۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ اگر صاحب انصاف آیۃ فتح میں نظر انصاف سے غور کرے تو معلوم کر لے گا کہ یہ آیۃ اعلیٰ درجہ تعریف و تمجید پیغمبرؐ پر دال ہے نہ کہ حضرت کے گنہگار ہونے پر۔ بلکہ اگر ذنب کے معنی گناہ گھڑ دے جائیں تو مطلب و مفہوم درست نہیں رہتا۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ اے پیغمبرؐ ہم نے تجھے یہ فتح بین اس لئے عطا کی ہے کہ تیرے آئندہ و گذشتہ ذنوب کو مغفور کر دیں اور انہی نعمتوں کو تجھ پر پورا کر دیں اور راستہ ہدایت کھول دیں اور نصرت عزیز عطا کریں۔

کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ یہ تمام انعامات حضرتؐ کے گناہ کا نتیجہ ہیں اور اس بنا پر آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام انعامات و فتوحات تجھے اس لئے دی ہیں کہ تیرے آئندہ گناہ معاف کر دیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اگر حضرتؐ سے گناہ صادر ہوتے تو عتاب الٰہی ہوتا۔ کوئی سزا مقرر کی جاتی یا کوئی بلا نازل کی جاتی یا کوئی کفارہ دفع گناہ کے لئے مقرر کیا جاتا۔ کہ یہ کفارہ تیرے اوپر اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ تیرے گناہ محو کئے جائیں۔ نہ یہ کہ یہ انعامات ہم نے اس لئے عطا کئے ہیں کہ تیرے گناہ بخش دیئے جائیں۔ یہ انعام خدا نے دیا ہے "تا کہ تیرا گناہ بخش دے۔" بالکل بے معنی ہے۔ آیت بکمال صراحت فضیلت پیغمبرؐ پر دال ہے نہ کہ حضرتؐ کے گنہگار ہونے جو ایسا خیال کرتا ہے وہ حقیقت قرآن بلکہ کلام اور لغت عرب سے بھی بے خبر ہے یہاں ذنب ہرگز بمعنی گناہ نہیں ہے۔ بلکہ اصلی اور حقیقی معنی لغوی میں

مستعمل ہے کہ خدا نے پیغمبر کی ابتدائی پس افتادگیوں کو اور آئندہ جو واقع ہوں مراتب عالیہ و درجات رفیعہ سے بدل دیا ہے اور اسباب تحصیل کمالات عالیہ و فاضلہ اس فتح روشن سے مہیا کر دیئے۔

☆☆☆☆☆

# درس دہم

اس آیت مجیدہ میں خلاق دو عالم مقام و مرتبہ و حقیقت نبوت اور حقیقت خلافت الٰہیہ (ولایت) کو بیان فرما رہا ہے۔ طبقات انبیاء اصول کافی میں مذکور ہیں۔ اس سے اسی مرتبہ تفاضل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بعض نفوس نبی علی نفسہ ہوتے ہیں۔ بعض کسی قوم پر مبعوث ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا۔ **ارسلنا الیکم رسولا شاھداً علیکم رسولا کما ارسلنا الی فرعون رسولا** اور بعض اولی العزم رسولؑ ہوتے ہیں۔ یعنی صاحبان شریعت اور پھر انہی انبیاء میں سے بعض وہ ہیں جو امام بھی ہوئے ہیں اور ریاست عامہ دینیہ و دنیویہ ظاہرۃ و باطنیہ حاصل اور ان تمام مراتب کا جامع خاتم النبیین حدیث مذکور میں انہی چاروں مراتب نبوت کو بیان کیا گیا ہے۔ مگر ذکر و فضیلیت ختم نبوت مخصوصاً اس میں مذکور نہیں ہے۔

اصول کافی: **الانبیاء والمرسلون علی اربع طبقات۔**

## انبیاء و مرسلین کے چار طبقے ہیں۔

1- **فنبی منبا فی نفسہ ولا یعدو غیرھا۔** پس محض نبی وہ ہوتا ہے جو اپنے ہی نفس پر نبی ہوتا ہے اور غیر تک اس کی نبوت متجاوز نہیں ہوتی۔

2- دوسرے رسول۔

3- تیسرے۔ اولو العزم رسول۔

4- چوتھے۔ رسول امامؑ۔ انی جاعلک للناس اماما۔

طبقات 4 چار ہیں۔

1- نبی

2- رسول

3- اولوالعزم رسول

4- رسول امام

بعض انبیاء اولوالعزم بھی ایسے تھے کہ رسولؑ تھے مگر امامؑ نہ تھے۔ جیسے کہ حضرت نوح علیہ السلام کہ رسول اولوالعزم وصاحبان شریعت سے ہیں مگر امامؑ نہیں ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا۔ الخ (ی) ایک لاکھ 24 ہزار۔ (رسول) 313۔ اولوالعزم رسول۔ پانچ یا چھ رسول امام۔ دو۔ خاتم المرسلین علیہ السلام رسول امام الخلق اور جناب ابراہیمؑ فقط امام الناس ہیں۔

نو، چھ، پانچ انبیاء مرسلین صاحبان شریعت و اولوالعزم رسول ہیں اور یہی سادات الانبیاء کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث کافی کے ذیل میں حضرت صادقؑ سے بھی یہی مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: سادۃ النبین والمرسلین خمسۃ ھم اولوالعزم من الرسل وعلیھم دارت الرحا. نوح و ابراھیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ و محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعلی جمیع الانبیاء۔

جو نبی صاحب شریعت نہیں ہوتے یا جو محض اپنے ہی نفس پر نبی ہوتے ہیں

(اور ایسے انبیاء) مثلاً حضرت خضرؑ کے زمانہ خاص میں بہت تھے جب آپ سکندر ذوالقرنین کے ساتھ ظلمات میں تشریف لے گئے ہیں۔ تو موافق حدیث صحیح معصومؑ چار ہزار انبیاء آپ کے ساتھ تھے) وہ سب صاحبانِ شریعت کی اقتداء کرتے تھے اور اسی واسطے اس حدیث کافی میں ان کی بابت یہ اشارہ کیا گیا ہے۔ **وعلیہ امام**۔ (اور اس پر اور پیشوا ہوتا ہے) اور امام سے مراد یہاں یقیناً لغوی معنی ہیں یعنی وہ خود اپنی شریعت نہیں رکھتے۔ دوسرے کے قانونِ شریعت پر چلتے تھے اور اس کو بیان بھی کرتے تھے۔ اگر کسی مسائل کے جواب میں بیان کی مزید ضرورت پڑ جائے تو ان کو علم اس شریعت کا بوحی الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ علامہ طبرسی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ لفظ امام کے دو معنی ہوتے ہیں۔ یعنی لغوی و اصطلاحی یعنی اول یہ کہ امام وہ ہوتا ہے جس کے اقوال و افعال میں اس کی اقتداء کی جائے۔ (مثلاً۔ پیش رو۔ پیشوا۔ پیش امام)

دوسرے امام وہ پیشوائے دین سے جو تدبیر و سیاست امت کو انجام دے اس کے معاملات کو درست کرے۔ مجرموں کو سزا دے۔ حکام مقرر کرے۔ گنہگاروں پر حدود قائم کرے۔ امت پر حملہ کرنے والوں سے جہاد کرے اور حوزہ دین سے کفار کا دفاع کرے۔ پس پہلے معنی (لغوی) کی رو سے تو ہر ایک نبی کو بھی امام کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک کی اس کے اقوال و افعال میں اقتداء کی جاتی ہے اور معنی لغوی امام اس پر صادق آتے ہیں) اور دوسرے معنی اصطلاحی کی رو سے ضروری نہیں کہ ہر نبی امام ہو کیونکہ جائز اور ممکن ہے کہ بعض نبی اس سیاست امت پر مامور نہ ہوئے ہوں (اور نہ ہوئے تھے) اور جہاد دفاع ان کا فریضہ نہ تھا۔ پس جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کا بعض کلمات میں امتحان لیا اور وہ پورے اترے۔ تو ان کو امام الناس بنایا۔

حفاظت: کیونکہ حفاظت و جہاد کا تعلق امامت سے ہوتا ہے۔ اس لئے ابراہیمؑ نے جہاد اور بت شکنی شروع کی۔ (یہ جہاد فریضہ امامت ہے نہ رسالت) حضرت ابراہیمؑ کی امامت میں زمان کی قید بھی ہے اور مکان کی بھی۔ زمان کی قید سے مراد کہ وہ اپنے وجود ظاہری جسمانی سے قبل کے ازمنہ میں وہ امام نہ تھے اپنے زمانے میں امام ہوئے۔ مکان کی قید بھی ہے کہ وہ صرف زمین میں امام ہیں آسمان میں نہیں اور دیگر کرات اراضی میں نہیں اور مامومین کی بھی قید ہے کہ وہ ساری کائنات کے لئے امام نہیں بلکہ وہ الناس لوگوں کے امام ہیں۔ وہ بھی زمانہ حاضر و استقبال کے لئے۔ سرکار دو عالمؐ امام الخلق ہیں۔ امام العالمین ہیں۔ ان کی امامت مطلقہ کلیہ ہے تمام عالمین پر۔ آپؐ ہی رسول امام ہیں۔

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا۔

سرکارؐ دو عالم پر نبوت ختم ہے اور بعد میں ان کی ذریت میں نبوت نہیں ہے۔ بلکہ امامت کلیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جو اول الخلوقین ہیں امام مطلق ہادی مطلق ہونے کی صلاحیت و اہلیت رکھتے ہیں۔ ان میں وہی مطلق امامت امامت مطلقہ کی صورت یا ظاہر ہوئی کیونکہ مطلق امامت کی ہر صفت مطلق۔ مقید و غیر مقید پر صادق آتی اور آسکتی ہے۔ رسالت کے 4 طبقے بیان ہو چکے ہیں۔

## رسالت خاتم کے پانچ عہدے ہیں۔

1- خلیفۃ اللہ۔ 2- ولی اللہ۔
3- نبی اللہ۔ 4- رسول اللہ۔
5- امام الخلق۔

## امامت مطلقہ کے بھی پانچ عہدے ہیں۔

1- خلیفۃ اللہ۔ 2- ولی اللہ۔
3- اولی الامر۔ 4- ہادی خلق۔
5- امام الخلق۔

سرکارؐ دو عالم ان پانچ عہدوں کے مالک تھے۔

## اول۔ خلافت الٰہیہ

جس کی ابتداء عالم جسمانی میں حضرت آدمؑ سے ہوئی۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ۔ جعل الٰہی جتلا رہا ہے کہ یہ خلافت زمین میں ہے۔ جب تک زمین باقی ہے خلافت باقی۔ جب زمین منخسف ہو جائے گی (دھنس) جائے گی اور دنیا ختم تو خلافت الٰہیہ بھی ختم اور منقطع ہو جائے گی اور پھر یہ سلسلہ دوسرے عالم میں قائم۔

اور یہ خلافت الٰہیہ ہی نبوت و رسالت اور امامت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی خلیفہ خدا ہی ہادی خلق نبی یا امام ہوتا ہے۔ یا کہئے کہ نبی یا امام خلیفہ خدا ہی ہوتا ہے۔ غیر خلیفۃ اللہ نبی یا امام نہیں ہو سکتا اور غیر نبی یا امام خلیفہ خدا نہیں کہلا سکتا۔ تو بلاشبہ نبی آخر الزمانؐ خلیفۃ اللہ بلکہ خلیفۃ اللہ الاعظم ہیں۔

## دوم: باطن نبوت

باطن نبوت (خلافت الٰہیہ) دراصل ولایت ہے۔ ہر نبی ولی اللہ ہوتا ہے مگر

ہر ولی اللہ نبی اللہ نہیں ہوتا۔ (ہر نبی ولی ہوتا ہے مگر ہر ولی نبی نہیں ہوتا) اور ہر خلیفۃ خدا ولی اللہ ہوتا ہے۔ بغیر ولایت خلافت اللہ نہیں مل سکتی۔ النبی لہ وجہان. وجہہ الی الحق ووجہہ الی الخلق۔ نبی کے دو وجہیں ہیں۔ یعنی دو رخ یا دو چہرے ہوتے ہیں۔ نبی کا ایک رخ (چہرہ) حق (خالق) کی طرف ہوتا ہے کہ اس سے قرب و تعلق رکھتا ہے اور دوسرا خلق کی طرف ہوتا ہے کہ ان کو پہنچاتا ہے۔ فہو وجہہ الی الحق ولی وہو وجہہ الی الخلق نبی۔ جو نبی کا چہرہ حق خالق کی طرف ہوتا ہے اس طرف سے نبی ولی اللہ ہوتا ہے اور نبی کا چہرہ مخلوق کی طرف ہوتا ہے اس طرح سے نبی اللہ ہوتا ہے۔ جو ہر اول یعنی (محمد مصطفیٰ) دو کام کرتا ہے۔ خدا سے لیتا ہے اور مخلوق کو پہنچاتا ہے لیتے وقت ولایت ہے اور پہنچاتے وقت نبوت ہے۔ پس ولایت باطن نبوت ہے اور نبوت ظاہر ولایت ہے۔ اس لئے عرفاء نے کہا کہ نبوت وضع حجاب ہے اور ولایت کشف حجاب ہے یہاں نبوت میں پردہ رکھا جاتا ہے اور ولایت میں اٹھا دیا جاتا ہے۔ نبوت ختم ہو سکتی ہے مگر ہدایت الناس ختم نہیں ہو سکتی۔ قیامت تک لوگ ایسے ہی ہدایت ہادی کے محتاج ہیں جیسے کہ آنحضرتؐ سے پہلے تھے یا حضرتؐ کے زمانہ سے ہیں اور چونکہ اب قیامت تک دین دین محمدی ہے اور حضورؐ عالم جسمانی سے انتقال فرما گئے تو آپؐ کے بعد آپ کے جانشین ہادی خلق ہونگے اور سب خلیفۃ اللہ۔ ولی اللہ امام الخلق ہونگے اور جانشین رسولؐ کے پانچ خطاب ہونگے۔

1۔ خلیفۃ اللہ۔ لیستخلفنھم فی الارض۔

2۔ ولی اللہ۔ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۝

3-اولی الامر۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

4-ہادی خلق۔ انما انت منذر ولکل قوم ھاد۔

5-امام الخلق۔ وکل شی احصیناہ فی امام مبین۔

ہدایت خلق و خلافت اللہ قیامت تک باقی ہے اور خلافت اللہ نبوت و امامت ہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ نبوت ختم ہوگئی تو امامت کا باقی رہنا ضروری ہوا اور وہ باقی ہے۔

امامت منزلت انبیاء وارثِ اوصیاء ہے۔ یہ امامت خلافۃ اللہ وخلافۃ الرسول ہے۔ یہ مقام امیر المومنین ہے۔ امامت زمام دین ونظام مسلمین ہے یعنی ریاست عامہ کا نام ہے۔

امام ہی کے وسیلے سے تمام فروعات کا قیام ہوتا ہے۔ امام حدود وتعزیرات و قصاص کو جاری کرتا ہے۔ امام دین اللہ سے دشمنوں کو دفع کرتا ہے۔ حکمت وموعظہ حسنہ اور حجۃ قاطعہ سے دین الٰہی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ امام کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب (سورج) دنیا کو اپنے نور سے روشن کرتا ہے۔ امام عالم امکان کو اپنے نور علم وحکمت سے روشنی بخشتا ہے امام ایسا بلند مقام ہے کہ وہاں تک نہ ہاتھوں کی رسائی ہے نہ آنکھوں کی۔ امام بدر منیر۔ نور ساطع اور نجم ہادی ہے جو تمام تاریکیوں کو کھول دیتا ہے۔

امام وہ دلیل ورہنما ہے جو خطرات ومہالک سے بچاتا ہے جو اس سے جدا ہوا وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ امام سحاب فیض الٰہی ہوتا ہے۔ امام شمس ہدایت ہوتا ہے۔ امام ارض رحمت ہوتا ہے۔ امام چشمہ آب حیات اور روضہ نعمات ہوتا ہے۔ امام ہر انسان کے لئے انیس۔ رفیق و پدر شفیق اور برادر شفیق ہوتا ہے۔ امام بچوں کا مربی

(عام) اور مصائب ودواہی میں ہر ایک کا ناصر ومددگار مشکل کشا ہوتا ہے اور جائے پناہ ہوتا ہے۔ **الامام امین اللہ فی خلقہ وحجتہ علی عبادہ وخلیفتہ فی بلادہ** امام خلق میں امین خدا۔ بندوں پر حجت خدا اور ملک خدا میں خلیفۃ خدا۔ اس کا جانشین ونائب ہے امام ہی داعی الی اللہ ہوتا ہے۔ حرم خدا کا محافظ۔ گناہوں سے پاک عیوب سے مبرا علم الٰہی سے مخصوص۔ حلم میں معروف۔ عزت مسلمین غیظ کافرین اور تباہ کنندہ منافقین ہے۔

**کیف لھم باختیار الامام والامام عالم لایجھل وداع لاینکل ومعدن القدس والطھارۃ والنسک والزھادۃ والعلم والعبادۃ مخصوص بدعوۃ الرسول ونسل المطھرۃ البتول۔** کیونکر وہ امام کا انتخاب (اجماع یا شوری سے کر سکتے ہیں) حالانکہ امام وہ عالم کل ہوتا ہے جو کسی علم اور کسی بات سے جاہل نہیں ہوتا۔ وہ داعی الی الحق ہوتا ہے وہ کسی وقت خطا نہیں کرتا۔ امام معدن تقدس وطہارت وریاضت وزہادت وعلم وعبادت ہوتا ہے۔ دعوت رسول اسی سے مخصوص ہے اور وہ نسل مطہر بتول ہی سے ہوتا ہے۔

اس کے نسب میں عیب نہیں ہوتا حسب میں کوئی فرد اس کے مقابل نہیں ہو سکتا۔ وہ قریش کی چوٹی کے خاندان بنی ہاشم وعترت رسول ہی سے ہوتا ہے اور رضاء الٰہی ہی سے مقرر ہوتا ہے۔ **یعنی مرتضی من اللہ** اور مفترض الطاعۃ ہوتا ہے۔ اس کے شان میں خالق نے فرمایا۔ **وکل شی احصیناہ فی امام مبین** ○ یہ تمام علوم امام کی فطرت (سرشت) خلقت میں داخل ہوتے ہیں۔

فطرت: کی لفظ قرآن مجید میں آئی ہے اس کی تشریح ضروری ہے۔

فطر: لغت میں بھی شگافتن ہے۔ پس محاورہ میں یوں کہا جاتا ہے فطرتہ فانفطر میں نے اس شق کیا (دو ٹکڑے کیا) پس وہ شق ہو گیا (دو ٹکڑے ہو گیا) اور اصطلاح میں فطر کے معنی عدم سے کسی چیز کو پیدا کرنا یعنی عدم کو چیر کر ایجاد کرنا اور یہی معنی ہیں آیۂ شریفہ فطر السموات والارض۔ یعنی پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو عدم محض سے۔ اسی سے فطرت ہے جس کے معنی آفرینش۔ خلقت۔ سرشت کے ہیں۔

پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز فلاں چیز میں فطری ہے یا فطرۃً موجود ہے تو اس سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ اصل آفرینش و خلقت و سرشت میں اس کے پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہم یوں کہیں کہ دین انسان کی فطرت میں موجود ہے یا تدین انسان کے لئے فطری ہے یا انسان بالفطرۃ متدین ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ نفس خلقت انسان خدا نے دین قرار دیا ہے یعنی جس وقت اس کو عدم سے وجود میں لایا۔

اور جس چیز پر فطرت دلالت کرے یا شہادت دے وہ یقینی اور مطابق واقع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی شہادت اور یہ دلالت بوضع اولی الٰہی ہے خدا نے یہ اثر اس میں رکھا ہے۔ کسی دوسرے فعل کو یہاں دخل نہیں۔ پس اس کی شہادت و دلالت میں غلطی اور خطا کا شبہ نہیں۔ آثار فطری یقینی الثبوت ہیں۔ پس جس چیز کو فطرت مقتضی ہو وہ حق اور مطابق واقع قطعی الثبوت ہوگی اور اس کا انکار انکار بدیہی (جیسے روز روشن میں وجود آفتاب کا انکار)

مثال: اگر ایک حکیم کامل ایک معجون درست کرے اور مختلفۃ الاثر و مختلفۃ الکیفیت ادویہ مفردہ کو اس طرح جمع کرے کہ اس میں ایک حالت اعتدال پیدا ہو جائے یعنی ہر ایک دوا اتنی مقدار میں لے کر کہ ہر ایک اثر ذاتی قائم رہے اور ایک

دوسرے کے اثر کو نیست و نابود (مٹا دینا) نہ کر سکے اور سب سے مل کر ایک کیفیت معتدلہ اور ایک حالت اعتدالی پیدا ہو جائے۔ مثلاً ایک درجہ چہارم میں گرم و خشک اور دوسری درجہ دوم میں سرد و تر۔ تیسری درجہ دوم میں سرد و خشک اور چوتھی مثلاً آخر درجہ میں گرم و خشک وعلیٰ ہذا۔ پس ان میں سے ہر ایک کو اتنی مقدار میں لے کہ حرارت و برودت و یبوست و رطوبت مرکب کی مساوی اور معتدل ہو جائے۔ پس اس سے جو اثر و کیفیت خاصہ معتدلہ پیدا ہو گی وہ فطری و ذاتی ہو گی۔

اس مثال کے بعد ہم کہتے ہیں کہ انسان مثلاً اجزاء مختلفہ متضادہ و متبائنہ سے مرکب ہے۔ یعنی عنصر اربعہ (مفردہ) آگ، ہوا، مٹی (خاک) پانی جن میں سے ہر ایک دوسرے کی ضد ہے۔ ان اجزاء متضادہ کو خداوند عالم حکیم مطلق و صانع برحق نے اپنی حکمت کاملہ سے اس طرح مرکب کیا ہے کہ ان میں ایک حالت اعتدال و تساوی پیدا ہو گئی ہے۔ نہ پانی آگ کو بجھا سکتا ہے۔ نہ آگ پانی کو جلا کر فنا کر سکتی ہے۔ علی ھذا القیاس۔

آگ کی گرمی اور پانی ٹھنڈک وغیرہ کچھ کچھ کم ہو کر معتدل ہو گئی ہیں۔ پھر خداوند عالم نے ان کے قوام وجود کو قائم باقی رکھنے کے واسطے ایک جوہر خاص جو ان سے جدا اور ان پر محیط و حاوی ہے بطور حاکم قرار دیا ہے جس کو مثلاً روح کہتے ہیں۔ تا کہ ایک دوسرے پر غالب آ کر اس کو فنا نہ کر سکے۔ جس طرح معجونات میں اطباء ایک جوہر خاص اور ایک روح مخصوص ایسی ڈالتے ہیں جو ان ادویہ کی ترکیب کو قائم رکھے اور ان کے اثر کو باقی۔

پس ان اجزاء کی حالت اعتدال اور اس روح کی تاثیر سے جو اثرات پیدا

ہوتے ہیں وہ فطری ہیں اور یقینی الاعتقاد اور ان کی دلالت دلالت قطعی اور مطابق واقع ہے۔ کیونکہ یہ وضع الٰہی اور یہ ترکیب خداوندی ہے۔

پس جس چیز کو فطرتِ اشیا مقتضی ہو اس کے یقینی اور صحیح اور عین مطابق واقع ہونے میں کسی طرح کا شبہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جس امر اور جس بات کو خود فطرتِ انسان مقتضی ہو اور اس کی سرشت اور خلقت میں موجود اس کے برحق اور لازم الاعتقاد والا تباع ہونے میں کسی صاحب عقل کو شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ جس کا کسی طرح انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی دلیل اور کوئی شہادت ایسی ہے جس کو کوئی رد نہ کرسکے اور کوئی دلیل اس کے معارض نہ ہوسکے وہ شہادت فطری اور دلالت فطری ہے پس اگر انسان عقل سلیم وطبع مستقیم رکھتا ہو تو اختلاف مذاہب عالم کو یہاں سے سمجھ سکتا ہے اور حق وباطل میں تمیز دے سکتا ہے۔ جو دین مطابق فطرتِ انسانی ہو وہ بلاشک وشبہ حق ہے اور صادق اور جو دین مطابق فطرت نہ ہو وہ یقیناً باطل ہے۔

کیونکہ جو چیز خلاف فطرتِ انسانی ہے انسان ہرگز اس کو قبول نہیں کرسکتا اور اس کی تکلیف اس کے واسطے بلاشک تکلیف مالایطاق ہے۔ مثلاً: اگر انسان میں سننے کی قوت نہ ہو اور اس کی فطرت وسرشت اس کو مقتضی نہ ہو اس کو سننے کی تکلیف دی جائے تو بلاشک وشبہ یہ تکلیف تکلیف مالایطاق ہے اور کبھی حکیم مطلق ایسا نہیں کرسکتا پس۔ (دین ہرگز خلاف فطرت نہیں ہوسکتا) اب ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر کوئی دین دنیا میں بالکلیہ مطابق فطرتِ انسان بلکہ مطابق وموافق فطرتِ عوالم ہے وہ دین اسلام ہے۔

کوئی اصلِ اصول دین اسلام سے اور کوئی رکن ارکانِ دین سے خلاف

فطرت نہیں ہے دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان فطرۃً متدین ہے۔ فطرتِ انسان مقتضی ہے کہ وہ ضرور ایک دین کا قائل ہو اور یہ مطلب بالکلیہ ضروری ہے کیونکہ کوئی فرد افراد انسان سے ایسا نہیں کہ جو ایک دین کا قائل و پابند نہ ہو۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جو منکر خدا ہیں یعنی (مادین طبعیین) وہ بھی ایک دین کے قائل و پابند ہیں ہر عاقل وسفیہ۔ عالم وجاہل۔ مومن وکافر وظہ لابد ایک دین کا قائل ہے۔ حتی کہ ان لوگوں میں بھی جو بادیہ نشین وخانہ بدوش ہیں۔

پھر سوال ہوا کہ دین کیا ہے۔ مختصراً جواب یہ ہے کہ تمام افراد انسانی کے درمیان اصول مشترکہ عامہ کا نام دین ہے۔ یعنی (آداب وقواعد ومعاشرت) پس کوئی شخص اشخاصِ نوع انسان سے ایسا نہیں جو دین کا قائل نہ ہو۔ کوئی شخص اپنے کو اس سے خالی نہیں کر سکتا کیونکہ جب دین اس کی فطرت میں داخل ہوا اور لازمِ انسانیت ٹھہرا تو جب تک انسان انسان ہے دین سے خالی نہیں ہو سکتا خواہ جاہل ہو یا عالم۔ عاقل یا سفیہ وغیرھم۔ گویا دین سے خالی ہونا انسانیت سے خارج ہونا ہے۔ اس لئے جب فطرتِ انسان الٰہی ہے تو اس سے خالی ہونا فطرت وآفرینش سے خالی وخارج ہونا ہے۔

پس یہ قطعاً محال ہوا کہ انسان انسان ہو اور متدین نہ ہو۔ کیونکہ انسان محتاج پیدا کیا گیا ہے بخلاف دوسرے حیوانات کے وہ اپنی پرورش اور اپنی زندگی بسر کرنے میں دوسرے کے محتاج نہیں ہیں۔ جب خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت ومصلحت سے انسان کو بالفطرہ محتاج پیدا کیا ہے تو ضرور ہے کہ فطرۃً ہی رفع احتیاج کا علم بھی اس کو عطا کرے۔ ورنہ ظلم صریح لازم آتا ہے کیونکہ جب محتاج بنایا اور رفع حوائج وضروریات کا علم اس کو نہ دیا کہ کس طرح اپنی ان (حاجات) حوائج کو پورا کرے تو بلاشبہ یہ ظلم ہے

جو عدلِ محض کی ذات سے بہت بعید ہے۔

نیز اس کی خلقت لغو ہوگی کیونکہ جب وہ اپنی ضروریات وحوائج کو رفع نہ کر سکے گا تو ضرور ہلاک ہو جائے گا۔ پس اس کا پیدا کرنا اور وجود میں لانا لغو و بے فائدہ ٹھہرا اور حکیم مطلق سے ایسا فعل ہو نہیں سکتا۔ پس ضروری ہوا کہ جس طرح وہ محتاج ہے بالفطرۃ اسی طرح وہ عالم بھی ہو دفع ضروریات وطرق رفع حوائج کا یعنی ان قواعد و آداب معاشرت کا جن کے ذریعے سے اپنی ضروریات کو پورا کر کے زندہ رہ سکتا ہے اور زندگی بسر کر سکتا ہے اور اپنے کمالات لائقہ کی تحصیل کر سکتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ انسان بالفطرۃ عالم ہے۔ آداب وقواعد معاشرت کا کہ اس کو کس طرح دنیا میں زندگی بسر کرنی چاہئے اور اس کی تدین کہتے ہیں اور اصل دیانت وتدین یہی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ انسان فطرۃً متدین ہے اور دین فطری انسان ہے۔ اس لئے کوئی فرد افراد انسان کی دین سے خالی نہیں ہو سکتی ہر شخص قائل ہے اس امر کا کہ اس کے افعال واعمال ضرور حدود قواعد وآداب کے اندر صادر ہونے چاہئیں اور اسی پر نظامِ عالم جاری وساری ہے۔ قرآن نے من حیث التکوین اور بلحاظِ تدوین تمام اصولوں کو ایک آیت میں جمع کر دیا ہے۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن بطور اعجاز نازل ہوا ہے۔ **ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون۔**

تحقیق اللہ امر کرتا ہے عدل واحسان اور ذوی القربی کو عطا کرنے کا اور نہی کرتا ہے فحشاء (بدکاری) ومنکر (فعل قبیح ومکروہ) اور بغی (ظلم سے) نصیحت کرتا ہے تم کو کہ شاید تم یاد کرو اور نصیحت پکڑو۔ اس آیۃ مجیدہ میں تین چیزوں کا حکم اور تین سے

نہی ہے۔ دیکھئے کیسے جامع اصول ہیں کہ جن پر بقاء نوعی و شخصی و حصولِ کمالات لائقہ مبنی اور نظام عالم موقوف ہے۔ یہی اصول اصولِ تمدن ہیں اور انہی کا نام تدین ہے۔

یاد اسی چیز کو دلاتے ہیں جس کا پہلے سے علم ہو۔ پس اگر یہ اصول فطرتِ انسان میں موجود نہ ہوتے تو خداوند عالم تذکر کی خواہش نہ کرتا۔ **ولقد علمتم النشاء ۃ الاولی فلو لاتذکرون**۔ البتہ تم جانتے ہو عالم اولی کو پس تم کیوں یاد نہیں کرتے۔ **فذکر انما انت مذکر لست علیھم بمصیطر** پس اے پیغمبرؐ یاد دلاتو یاد دلانے والا ہے اور ان پر مسلط و داروغہ نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ انسان فطرۃً ان اصول کا عالم ہے اور اس کی فطرت میں موجود ہیں اور ثابت ہوا کہ تدین فطری انسان ہے۔

**فاقھم وجھک للد ین حنیفا فطرۃ اللہ انی فطرالناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمونo** اپنی توجہ باطنی کو مستحکم کردیں دین حنیف کے واسطے۔ یہ فطرت الٰہی ہے۔ جس پر تم آدمیوں کو خدا نے خلق فرمایا ہے اور خلق خداوندی کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا دین قیم (محکم واستوا) ہیں ہے لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔ اس آیۃ مبارکہ سے صراحتہً ثابت ہے کہ دین فطری انسان ہے تمام انسان دین پر مفطور ہیں اور ان کی خلقت تدین پر ہے۔

حیوان میں بھی تدین فطری ہے۔ یعنی ان کے افعال و اعمال بھی آداب و قواعد کی حدود میں صادر ہوتا ہیں۔ یہ دعویٰ بالمشاہدہ ثابت ہے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کتا مثلاً آپ کے دسترخوان کے پاس بیٹھا ہوا ہوتا ہے آپ اس کو روٹی ڈالتے ہیں وہ اٹھا کر بلاخوف کھالیتا ہے اور نہایت اطمینان سے بیٹھا رہتا ہے اگر مارو تب بھی مشکل ہی

سے جائے گا بخلاف اس کے اگر وہ ایک لقمہ بھی آپ کے دستر خوان پر سے بلا اجازت اٹھالے چوری یا زبردستی تو لقمہ اٹھاتے ہی فوراً بھاگ جائے گا۔ یا (بلی کسی مکان سے کوئی چیز چراتی ہے تو فوراً آہٹ پاتے ہی بھاگ جاتی ہے اور بعض اوقات بلا آہٹ ہی بلکہ صاحب شی کو خبر بھی نہیں ہوتی وہ چراتے ہی چپکے سے نکل جاتی ہے) ان دونوں فعلوں میں فرق ظاہر ہے۔ پہلے روٹی کھا کر بیٹھا رہنا اور دوسری صورت میں لقمہ اٹھاتے بھاگ جانا صاف اس بات کو بتلاتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اس امر کو کہ دوسرا فعل اس سے خلاف آداب وقواعد معاشرت صادر ہوا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ وہ بھی فطرۃً عالم ہے آداب وقواعد معاشرت کا اور جانتا ہے کہ میرے افعال خاص قواعد کی حدود میں صادر ہونے چاہئیں اگر اس کے برخلاف کروں گا تو مستوجب مذمت اور مستحق سزا ہوں گا اور اسی کو تدین کہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا حیوانوں میں بھی تدین فطری ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حسن وقبح کا علم حیوانات کو فطری ہے۔

پس جب جنس حیوانات میں تدین فطری ہوا کہ ان کے افعال واعمال قواعد و آداب معاشرت کی حدود میں صادر ہوتے ہیں اور وہ ان اچھائی وبرائی کو جانتے ہیں تو انسان جو اشرف مخلوقات ہے کیونکہ اس کے افعال واعمال حدود وقواعد وآداب میں صادر نہ ہونگے؟ اور کس طرح وہ ان کا فطرۃً عالم نہ ہوگا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کسی طرح آزاد مطلق نہیں ہوسکتا بایں معنی کہ اس کے افعال قواعد کی حدود میں صادر نہ ہوں۔ مطلق انسان جو چاہے کرتا پھرے۔ پابند عقل کبھی اس طرح آزاد نہیں ہوسکتا۔

العقل عقال۔ عقل زنجیر ہے۔ ہاں آزاد ہے اپنی فطری راہ میں نہ مطلقاً۔

# تدین اور تمدن میں فرق۔

## تمدن

تمدن اصولِ معاشرتِ شہری۔ دنیا میں بسر کرنے کے قواعد کا کام ہے۔

## تدین

تدین دینداری کا نام ہے۔

دونوں ایک ہیں۔ تدین عین تمدن ہے اور تمدن عین تدین ہے۔

## فرق

تدین صورتِ باطنی تمدن ہے اور تمدن صورت ظاہری تدین ہے۔ اور دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ تدین صورت اعتقادی کا نام ہے اور تمدن صورتِ عمل کا۔

مرتبہ اعتقاد تدین ہے اور مرتبہ عمل تمدن ہے۔ یعنی تدین میں اعتقاد شرط ہے اور تمدن میں نہیں اس میں صرف عمل کافی ہے مثلاً عدالت، صداقت، ردِ امانت، وغیرھا جو اصول تمدن ہیں اور جن کو جملہ افرادِ نوع انسانی قبول کرتے ہیں اور ان کی حسن وخوبی اور ان کے اضداد کی برائی میں سب کو اتفاق ہے۔ جو لوگ ان کو سمجھ کر معقولیت کے ساتھ ہر عمل کرتے ہیں وہ متمدن کہلاتے ہیں اور جو لوگ ان اصولوں کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں اور یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں کہ ان کے برخلاف کرنے میں خدا ہم سے باز پرس کرے گا اور وہ اپنے ہر فعل اور عمل اور ہر حرکت وسکون کو کس خاص نتیجے اور اثر کا مستوجب جانتے ہیں۔ جس کو جزا سزا کہتے ہیں۔ وہ متدین (دین دار) کہلاتے ہیں۔

بہر حال ان اصول پر اس اعتقاد مذکور کے ساتھ عمل کرنا دینداری کی نشانی

ہے اور بغیر اس اعتقاد کے عمل کرنا اور ان اعمال پر کسی سزا و جزا کا خدا کی جانب سے مرتب ہونے کا خیال نہ رکھنا بے دینی کی علامت ہے۔

لہٰذا اصول تمدن و تدین ایک ہی ہیں اور صورتِ عمل میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوسکتا۔ فرق صرف اعتقاد میں ہے۔

تمدن و تدین ایک ہی چیز ہیں صرف اعتباری فرق ہے۔ تو عقلاً ضروری ہوا بلکہ عقلاء کا اتفاق ہے کہ قوانین تمدن کے ایک مقنن (قانون بنانے والا) اور اس کے اجراء (جاری کرنا) کرنے والے کی ضرورت ہے۔ بعد اس کے وجود کے تمدن کی مشین نہیں چل سکتی۔ جب قوانین تمدن مقنن کے بغیر نہیں چل سکے۔ تو پھر کس طرح مقنن تدین کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ جس اصطلاحِ قرآن میں نبیؑ و رسول کہتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت نبیؑ باتفاق عقلا ثابت ہے اور فطرت اس پر شاہد ہے اور دلائل فطریہ و شہادت فطری قابل انکار نہیں یقینی الثبوت ہیں۔ اس لئے ضرورتِ نبی کا انکار کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ پس جبکہ بالضرورۃ ثابت ہے کہ دین انسان کی فطرت میں داخل ہے اور انسان بالفطرۃ متدین ہے یعنی اصول و قواعد و آداب معاشرت (جو عین تدین ہیں) کا فطرۃً عالم ہے اور ان کا قائل و معتقد اور ان پر عامل ہے۔ کوئی فرد انسان ایسا نہیں جو اصول کلیہ معاشرت کا انکار کر سکے۔ اگر انکار کرے تو داخل حیوانِ محض ہے انسان نہیں بلکہ حیوان سے بھی بدتر **اولئک کالانعام بل ھم اضل**۔

کیونکہ ثابت ہو چکا ہے کہ حیوان میں بھی تدین فطری موجود ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ ہر ایک موجود موجوداتِ عالم سے بالفطرۃ متدین ہے تو عین حق و مطابق واقع ہوگا۔

لیکن یہ بھی مشاہد و محسوس ہے کہ جس طرح تمام افراد انسانی خواہ وہ کسی

مذہب کے پابند ہوں یا نہ ہوں۔ اصول کلیہ معاشرت میں متفق ہیں اور سب قائل۔

اس طرح جزئیاتِ اصول میں مختلف ہیں۔ حتی کہ دو شخص بھی مشکل سے ملیں گے جو تمام جزئیات میں ایک دوسرے سے بالکل متفق ہوں۔ اب معلوم ہوا تدین دو قسم پر ہے۔

1- تدین نوعی۔ 2- تدین شخصی۔

## 1- تدین نوعی

یعنی وہ اصول کلیہ نوعیہ جس پر بقاءِ نوع و قیامِ نوع و تکمیل نوع من حیث ھو نوع موقوف ہے۔

## 2- تدین شخصی

یعنی وہ اصول و قواعد جن پر ترقی اشخاص موقوف ہے یہ ترقی بھی ترقی نوعی ہے لیکن باعتبار اشخاص و افراد۔

پس تدین نوعی میں کسی کو اختلاف نہیں سب متفق ہیں۔ اگر اس میں اختلاف ہوتا تو کبھی نوع باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاں تدین شخصی میں اختلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہزار ہا جدا جدا مذہب ہیں اور ہر ایک علیحدہ علیحدہ طریقہ رکھتا ہے۔

اشکال کا حل یہی سے ہو جاتا ہے کہ اگر تدین فطری ہے اور دین فطرت انسان میں داخل ہے تو پھر یہ اختلاف کہاں سے آیا اور اتنے مختلف مذاہب کیوں کر پیدا ہو گئے؟ اگر دین فطری ہوتا تو تمام انسان ایک مذہب پر ہوتے اور سب دیندار ہوتے یہ تمام بے دینی و شرک و الحاد کہاں سے آیا؟

جواب اس کا یہی ہے کہ تدین نوعی میں کسی کو اختلاف نہیں سب متفق ہیں اور تبدین نوعی متدین ہیں۔ اختلاف تدینات شخصیہ میں ہے پس تمام انسان متدین ہیں بتدین نوعی۔ لہٰذا کوئی اعتراض نہیں۔ اب رہا یہ امر کہ تدین شخصی میں کیوں اختلاف ہے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان تمام جزئیات فطریہ کا عالم نہیں۔ کلیاتِ فطرت کا عالم ہے کیونکہ جزئیات کا وہی عالم ہوسکتا ہے جو تمام اجزاء فطریہ کی ماہیت و کمیت و کیفیت سے کماحقہ آگاہی رکھتا ہو۔ اور یہ امر ممکن نہیں ہے مگر اس شخص کے لئے جو ان کا خالق و صانع ہے۔ مادہ جان سکتا ہے جس کے سامنے خلق کی گئی ہیں۔

علت اس کی یہ ہے کہ آثار کلیہ ظاہر تر ہوتے ہیں اور جزئیات خفی پوشیدہ مثلاً ایک حکیم حاذق ایک معجون تیار کرتا ہے کسی ایک خاص مرض کے لئے پس مریض اس کو استعمال کرتا ہے۔ تو اس کے اس فائدے کو محسوس کرتا ہے جو اس مرض خاص کو پہنچتا ہے اور جو اس کا فائدہ کلیہ ہے۔ لیکن اُس معجون کے تمام اجزاء جو فرداً فرداً جزوں امراض کو مفید ہوتے ہیں اور اثر کرتے ہیں یا آئندہ پیدا ہونے والے امراض کو روکتے ہیں یا بعض مواد فاسدہ کو رفع کرتے ہیں۔ ان کو مریض محسوس نہیں کرسکتا البتہ وہ حکیم حاذق ان کو جانتا ہے اور ان کے اثرات کو سمجھتا ہے۔ یہ بھی ایک دلیل فطری ہے۔ جو دلالت کرتی ہے اس امر پر کہ اس عالم میں ایک ایسا شخص ہونا چاہئے جو تمام فطریات کا عالم ہو اور ان کی ماہیت و کیمیت و کیفیت سے آگاہ ہو اور یہ نہیں ہوسکتا مگر وہ شخص جو تمام فطریات پر علم احاطی رکھتا ہو اور دارائے علم موہبتی و معلم بتعلیم الٰہی ہو۔ اس کو ہم نبی و رسول و امام کہتے ہیں۔ اگر یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ ضرورت نہیں کہ ایک ایسا شخص دنیا میں ضرور ہو جو ابتداً بتعلیم الٰہی تمام اشیاء کی ماہیات و کیفیات اور ان کے

اثرات وغیرہ پر علم احاطی رکھتا ہو بلکہ رفتہ رفتہ تجربے سے انسان خواص واثرات انبیاء کو معلوم کر سکتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نوع انسان باقی رہ سکتا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ خیال دو وجوہ سے باطل ہے۔

**اوّل**: تو اس وجہ سے کہ اس تجربے کے واسطے ایک مدت چاہئے۔ مثلاً اگر حکیم چاہے کہ تجربے سے خواص واثرات ادویہ معلوم کرے تو اول سینکڑوں مریضوں کو ہلاک کرے گا۔ جب ایک تجربہ حاصل ہوگا۔ وہ بھی اثر وقتی و جزئی۔ پس ہزاروں جانیں تلف ہو کر ایک علم جزئی حاصل ہوگا اور یہ خداوند عالم کے لئے قبیح ہے کہ ہزارہا نفوس کو ضائع کرے جبکہ وہ قادر ہے کہ ایک شخص ایسا خلق فرمائے جو تمام خواص و اثرات اشیاء کا عالم ہو۔ پس جب وہ ایک کام بلا کسی نفس کے ضائع و ہلاک کئے ہوئے کرا سکتا ہے تو کیوں اس کے لئے ہزاروں جانیں تلف وضائع کرے گا۔ یہ امر قطعاً قبیح ہے اس کی شان اس سے ارفع واعلیٰ ہے۔

**دوم**: یہ اس علم کسی اور تجربے وغیرہ سے اشیاء کے واقعی اور سچے خواص و اثرات معلوم کرنا نہایت دشوار بلکہ محال ہے۔ ہزاروں برس کے بعد بھی آج تک کسی شی کا اثر واقعی معلوم نہ کر سکے۔ مشاہد ومحسوس ہے کہ اطباء متقدمین نے مثلاً جن ادویہ کو بعض امراض کے لئے مفید ثابت کیا ہے۔ متاخرین نے ان کو مضر بتلایا ہے اور یومیہ دیکھا جاتا کہ مدت مدید کی تحقیق کے بعد ایک دوا کا ایک اثر ثابت ہوتا ہے مگر کچھ عرصے میں وہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہی حال تمام اشیاء کی حقائق وماہیات کا ہے بڑے بڑے حکماء وعقلاء آخر کار اپنے عجز وقصور کے معترف ہوئے ہیں اور مدت العمر کی تحقیق کے بعد ان کو کہنا پڑا کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔

جب ان علوم کا یہ حال ہے تو کب نفس مطمئن ہوسکتا ہے اور یقین کرسکتا کہ جو کچھ ان علوم میں ثابت کیا گیا ہے وہ حق ہے اور جو خواص اشیاء مثلاً بیان کئے گئے ہیں وہ صحیح درست ہیں۔ جب تک ایک ایسا عالم موجود نہ ہو جس کے علم میں کسی طرح کا شک وشبہ نہ ہو سکے اور ہر قسم کی غلطی اس کے لئے ممکن ہی نہ ہو۔

اس وقت تک ہرگز اطمینان قلب وسکون نفس حاصل نہیں ہوسکتا اور قبیح ہے کہ خدا اپنے بندوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دے اور ایسے ناقص العلم کے حوالے کر دے لہٰذا ایک ایسے عالم کا وجود ضروری ہے جو کامل العلم ہو اور تمام فطریات کا بالفطرۃ عالم ہو۔ اور جزئیات [illegible] کے بالفطرۃ عالم نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ نظام عالم اس پر موقوف ہے کہ افراد انسانی مختلف طبقات میں ہوں۔ اگر تمام افراد ایک ہی درجہ رکھتے ہوں تو ہیئت اجتماعیہ منتظم نہیں ہوسکتی اور تمدن کی مشین ہرگز نہیں چل سکتی۔ ضروری ہے کہ افراد انسان مختلف و متفاوت درجہ رکھتے ہوں کیونکہ اصل نظامِ عالم قانونِ تسخیر پر مبنی ہے کہ ایک دوسرے کے تحت تسخیر ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صریح وصاف الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔

اھم یقسمون رحمة ربک نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیواة الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات یستخذ بعضھم بعضا سخریاo

کیا وہ لوگ تیرے پروردگار کی رحمت تقسیم کرتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں ہم نے تقسیم کیا ہے اور دنیا میں ان کی معیشت کو اور بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے تا کہ ایک دوسرے کے تحت تسخیر میں رہے۔

اس آیہ مبارکہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نظام عالم قانون تسخیر پر مبنی ہے کہ افرادِ انسانی مختلف طبقات و درجات میں ہوں۔ کوئی خادم کوئی مخدوم۔ ایک حاکم دوسرا محکوم۔ یہ بادشاہ وہ رعیت وغیرہ لہٰذا اگر تمام افراد انسان جزئیات علوم و جزئیات اصولِ تمدن کے بالفطرۃ عالم ہوں۔ تو لابد سب کے سب علوم میں مساوی ہوں گے اور اصل شرف و فضیلت علم ہے اس لئے فاضل و مفضول و شریف غیر شریف کا فرق نہ رہے گا اور جب یہ سب مساوی المرتبہ ہوئے تو تابع متبوع، حاکم محکوم، خادم مخدوم بادشاہ رعیت کی تمیز اٹھ جائے گی اور قانونِ تسخیر ٹوٹ جائے گا اور شیرازۂ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اس واسطے حکیم مطلق نے اپنی حکمت کاملہ سے کلیات اصول میں سب کو مساوی رکھا اور بالفطرق عالم قرار دیا۔ کیونکہ یہاں بقاءِ نوع اسی پر موقوف ہے اور جزئیات میں مختلف قرار دیا اور سب کو بالفطرۃ عالم بنایا اور خود ان کی سعی و کوشش پر چھوڑا تا کہ ہر ایک کا درجہ علیحدہ ہو۔ جو جیسی سعی کرے گا ویسا درجہ پاویگا اور اُسی اعتبار سے خادم مخدوم۔ حاکم محکوم کی تمیز ہو جائے گی اور قانونِ تسخیر درست۔ پس کلیات و جزئیات کا فرق دونوں بقاء نظام عالم کی غرض سے ہیں کلیات کے بالفطرہ عالم ہونے پر نظام مبنی ہے اور جزئیات کے بالفطرۃ نہ ہونے پر بلکہ کسب و اکتساب کے حاصل کرنے پر بقاء نوع موقوف ہے۔

پس نتیجہ نکلا کہ فطرتِ عالم مجبور کرتی تسلیم وجود نبی پر اور فطرت شہادت دیتی ہے کہ بلا وجود نبی بقاء عالم و تکمیل نوع انسانی و تحصیل کمالات لائقہ انسانیہ و حصول غرض ایجاد ممکن نہیں اور شہادت فطری، شہادت واقعی اور حصول یقین و اعتقاد کی دلیل قطعی ہے۔ لہٰذا عالمین میں ضرور ایک مربی عالم کا ہونا ضروری ہے۔ جو فطرت اشیاء کا عالم اور ان کے اجزاء

حقیقیہ واقعیہ۔ان کے اثرات وکیفیات اور طرق ترقی ونشوونما سے آگاہ ہو۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قانون تربیت تمام اشیاء میں جاری ہے اور اسی پر نظام عالم ہے۔ یہ مربی عالم کون ہوسکتا ہے؟ وہی ہوگا جو من جانب اللہ وتعلیم الٰہی فطریات اشیاء کا عالم ہو اور علم احاطی رکھتا ہو۔نہ علم اخباری۔اسی کو اصطلاح میں نبی مطلق کہتے ہیں اور قرآن کی زبان میں اسے باعتبار وقت خلیفہ' نبی رسولؐ وامام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

القائم بک ڈپو
بالمقابل امام بارگاہ بھون روڈ چکوال